تنقیدی اشارے

آل احمد سرور

تنقیدی اشارے

(معہ اضافہ جدیدہ)

آل احمد سرور



قیمت: بارہ روپے =/۱۲

فون نمبر ۲۶۱۳۵

ناشر

ادارہ فروغ اردو نمبر ۳۰ امین آباد پارک
لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ

مبارک بکڈپو، بندر روڈ، مقابل نیو ہال، کراچی ۲

مطبوعہ

نشر از قومی پریس لکھنؤ

اپنے

عزیز طلبا

کے

نام

کچھ اس کتاب کے متعلق

آیندہ اوراق میں میری ان تقریروں کا انتخاب نظر سے گذرے گا جو
گذشتہ چند سالوں میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے مختلف موضوع پر نشر ہوئیں
ان میں اکثر تقریریں بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں اور پسند کی گئیں
اس لئے اب ان کا کتابی صورت میں شائع کرنا شاید نامناسب نہ سمجھا جائے

ریڈیو پر جو تقریریں نشر ہوتی ہیں ان میں اور دوسرے مقالوں یا
مضامین میں فرق ہوتا ہے۔ ریڈیو میں تو وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ یہ اچھی
بھی ہوتی ہے اور بری بھی ہوتی ہے۔ پندرہ منٹ میں آدمی کیا کہے اور کیا چھوڑے
پھر بھی وقت کی پابندی سے یہ فائدہ ضرور رہتا ہے کہ بنیادی مسائل اور
خاص رجحانات یا نمایاں خصوصیات کا ذکر ہو جاتا ہے۔ ریڈیو سننے والوں
میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ادب کا ذوق ممکن ہے رکھتے
ہوں مگر ادب سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ بات
صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں کی جائے۔ زبان جہاں تک ہو سکے آسان
ہو اور علمی تحقیق کے بجائے پیرایہ بیان کی دلآویزی پر توجہ رہے۔ آسانی

زبان سے یہ مطلب نہیں کہ ادیب اپنے انداز کو چھوڑ دے یا زبان سے مخصوص آپ وہ رنگ کو ترک کر دے کہ وہ اپنے انداز کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائے اور اپنے سامعین کے حلقے کو وسیع کرے ریڈیو کا کام نہ تو محض سب کو ہنساتے رہنا ہے نہ محض نصیحت کرنا، اور نہ صرف اطلاع دینا اسے تو سماج کی باتوں کو گوارا بنا کے پیش کرنا ہے، اسے حقائق کو دلچسپ اور دلچسپی کو مفید بنانا ہے، اسے عوام کو ساتھ لینے کی خاطر ان کی زبان میں بات کرنا اور انہیں کی سطح پر ان سے ملنا ہے، مگر اس سطح پر ان سے ملنا ہے مگر اس سطح پر رہنا نہیں ہے بلکہ اسے رفتہ رفتہ بلند کر کے رہنا ہے اسے یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ ادبی مسائل یا علمی مسائل بھی زندگی کے ضروری مسائل ہیں، اور اچھی مفید اور ترقی پذیر زندگی کے لئے ان سے آشنا ہونا ضروری ہے ممکن ہے کہ میں اس مقصد کو واضح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہوں لیکن میرے سامنے یہ مقصد ضرور تھا۔

اب مجھے اپنے عام تنقیدی نقطہ نظر کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے ہمارے یہاں سنجیدہ تنقید نگاری اب جا کر شروع ہوئی ہے، لیکن اب بھی کچھ لوگ صرف قدیم ادب یا صرف جدید ادب کے پرستار ہیں، یہ بات ایک اچھے نقاد کے منصب کے خلاف ہے، وہ اپنے آپ کو اس طرح خانوں میں نہیں بانٹ رکھتا اس کے لئے تو ضروری ہے کہ سارے ادب پر نظر رکھتا ہو، اور اس میں ایک واضح نقطہ نظر دیکھتا ہو، وہ بعض قدیم چیزوں کو اچھا کہہ سکتا ہے اور بعض کو برا، مگر وہ سارے قدیم سرمائے کو ٹھکرا نہیں سکتا اسی طرح وہ ہر نئی چیز کو شبہ کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا، وہ بعض ادبی روایات کی قدر کرتا ہے مگر نئے

نئے تجربوں اور نئی نئی علامات سے بھڑک نہیں، وہ صرف ایک خاص
صنفِ سخن غزل ہی سے مانوس نہیں، ہر صنفِ سخن کو مخصوص کے کو سمجھتا
ہے یہاں تک کہ بے قافیہ نظم کو بھی اس وجہ سے برا نہیں کہہ سکتا کہ وہ
بے قافیہ ہے وہ جانبدار نہ ہو گا۔ ایمان داری سے اپنے خیالات کا
اظہار کرے گا۔

اس کا پہلا کام ترجمانی ہے پھر انصاف وہ ہر شاعر اور افسانہ نگار
کے آگے بھی رہے گا اور ساتھ بھی، وہ محض رنگوں کی ماہیت اور خوشبو
کے اجزا کے متعلق گفتگو نہ کرے گا۔ وہ اس رنگ و بو سے آشنا ہونا اور
اس کی قدر کرنا سکھائے گا۔ وہ محض تحریک کا قائل نہ ہو گا، کوئی تعمیری
تصور بھی رکھتا ہو گا، وہ تقلید اور اپج میں خود فرق کر سکے گا اور
دوسروں پر یہ فرق واضح کر سکے گا، اس کی طبیعت میں سنجیدگی اس
کے لہجے میں نرمی اور اس کی بات میں خلوص ہو گا۔ لفاظی، جانبداری،
سطحیت، قطعیت کا اس کے ہاں گذر نہ ہو گا۔

آئندہ صفحوں میں آپ کو جابجا انگریزی کے ادیبوں کے مقولے
ان سے موازنے الفاظ کے اشارے، ان کے حوالے ملیں گے۔ میں اسے برا نہیں
سمجھتا، اردو نے دوسرے ادبیات کے خزانوں سے بہت کچھ لیا ہے انگریزی
ایک زندہ عالمگیر اور ایک شاندار تاریخی میراث کی مالک زبان کی
حیثیت سے ہمیں ابھی بہت کچھ دے سکتی ہے، اس سے منہ موڑ کر بیٹھنا
اچھا نہیں، ہاں انگریزی ادب کے اصولوں کو اٹل سمجھنا یا صرف اس
معیار سے اپنی ہر چیز کو پسند یا نا پسند کرنا صحیح نہیں، ادبی اصول
عالمگیر بھی ہیں اور مقامی بھی۔ کسی میں ایک پہلو پر زیادہ زور دیا

گیا ہے کہیں کہیں دہرانے پر اس وحدت و کثرت سے گھبرانا نہیں چاہئے اسے
سمجھنا چاہئے۔

یہ تقریریں در اصل آل انڈیا ریڈیو کے لئے لکھی گئی تھیں اب
بعض ضروری اضافوں کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔

آخر میں مجھے محترم رشید احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو اور خواجہ منظور حسین
ریڈر شعبۂ انگریزی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان کے مخلصانہ تعاون میں
مجھے جو قیمتی مشورے ملتے رہتے ہیں ان کی تفصیل بیان کرنا میرے لئے
ناممکن ہوگا۔ ۱۹۴۲ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ   آل احمد سرور

نوٹ

تنقیدی اشارے کا یہ دوسرا ایڈیشن سات برس کے بعد شائع ہو رہا
ہے اس عرصے میں میرا ادبی نقطۂ نظر بہت کچھ بدلا ہے اس کتاب میں جو
رائیں ظاہر کی گئی ہیں ان سے تمام تر مجھے اتفاق نہیں رہا لیکن بہت
بڑی حد تک اب بھی انہیں صحیح سمجھتا ہوں اس ایڈیشن میں کہیں
کہیں ترمیم بھی کی گئی ہے اور افسانہ نگاری پر اچھا مضمون دوبارہ
لکھا گیا ہے نیز چار مضامین خطوط میں شخصیت، اردو میں تنقید
حیات شبلی مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں نئے ہیں لیکن پوری
کتاب کو بدلنا نہ ممکن تھا نہ مناسب۔

پہلے ایڈیشن پر جو تبصرے ہوئے ان سے اس کتاب کی مقبولیت
میں شبہ نہیں رہا مضامین میں جو اختصار ہے وہ ریڈیو کی وجہ
سے ناگزیر تھا لیکن ایک اور حیثیت سے مفید بھی ہے۔ ان لوگوں

کے لئے جو اُردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن انہیں زیادہ وقت یا فرصت میسر نہیں یا ان کے لئے جو چند اشاروں کی مدد سے بہت کچھ پا سکتے ہیں۔ یہ کتاب اب بھی سود مند ہوگی۔ ہیں نے مذاکرہ سرے کی کتاب (.......) کو ہر طبقے کے لئے مفید اور دلچسپ پایا اور اسی کی یہاں تقلید کی گئی ہے۔ ادب کے ادوار اس کے شہ پاروں اس کے مشاہیر اور مخصوص کارناموں سے واقفیت اچھے ادبی ذوق کی بنیاد بن سکتی ہے، اس امید پر یہ کتاب دوبارہ شائع کی جارہی

ہیں نے اپنے ادبی نقطہ نظر کو قدرے تفصیل سے نئے اور پرانے چراغ۔ اردو تنقید کیا ہے؟ کے دیباچوں میں بیاں کر دیا ہے۔ لیکن ہیں اپنا نقطۂ نظر منوانے کے لئے ادب میں سنجیدہ علمی اور ماضی و حال دونوں سے آگاہ شعور کا مطالعہ کرتا ہوں ہمیں آج بھی ذہنی توانائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ ہم اپنی تہذیبی دولت کے صحیح وارث ثابت ہوں اور اس دولت ہیں خود بھی اضافہ کر سکیں۔ ۱۹۴۹ء

آل احمد سرور

تنقیدی اشارے کا تیسرا ایڈیشن اب ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ لکھنؤ شائع کر رہا ہے، اس ایڈیشن میں "زہر عشق" پر ایک مضمون اور بڑھا دیا گیا ہے کتاب ہیں کوئی ترمیم مناسب نہیں سمجھی گئی ہے تنقیدی اشارے کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہو گی ہے کہ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔

نعمت اللہ روڈ لکھنؤ
۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

آل احمد سرور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اُردو ناول کا ارتقا

ناول انگریزی لفظ ہے انگریزی کے اثر کے ساتھ ہی یہ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے یہاں قصے کہانیوں کا وجود نہ تھا یا داستان سرائی رائج نہ تھی یہ کہنا واقعات سے انکار ہوگا۔ الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا، بوستان خیال، باغ و بہار، فسانہ عجائب یہ سب قصے کہانیاں نہیں تو اور کیا ہیں۔ ان میں تخیل کی پرواز، حق و ناحق کا تصادم، حسن و عشق کی آویزش، کردار کے نمونے، انداز بیان کی خوبصورتی سب کچھ موجود ہے۔ ان کا پڑھنے والا ایک طلسمی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں عجیب و غریب شخصیتیں اسے محصور کرلیتی ہیں اور عجیب و غریب کارنامے حیرت میں ڈال دیتے ہیں وہ ایسی ایسی باتیں سنتا ہے ایسے ایسے مناظر دیکھتا ہے جنہیں ہماری اس مادی کثیف بے رنگ و بے ربط زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان داستانوں کو پڑھ کر آدمی مبہوت ہو سکتا ہے قائل نہیں ہو سکتا اس کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے، عاقبت نہیں سدھرتی اور بھو جاتا ہے کچھ پا جاتا ہے وہ تھوڑی دیر کے لئے زندگی اور اس کے مسائل بھول جاتا ہے زندگی اسے نہیں بھولتی۔

ان قصے کہانیوں اور ناولوں میں فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے ناول
اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ زندگی کیسی ہے اور
کس طرح پیش کی گئی ہے یہ دوسری بات ہے۔ ناول ایک مسلسل قصے کا دوسرا
نام ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ تاریخی نقطہ نظر سے صحیح ہو مگر ایسا ہو سکتا ہے
ناول سے بہت سے کام لئے گئے ہیں جس طرح شاعری سے لئے گئے ہیں۔ اس
کے ذریعہ سے طنز کے تیر برسائے گئے ہیں وعظ و نصیحت کے دفتر کھولے گئے
ہیں سیاسی مسائل حل کئے گئے ہیں مذہبی عقدوں کو سلجھایا گیا ہے اور علمی
مباحث بیان کئے گئے ہیں مگر یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ ناول کا اصل مقصد
تفریح بھی ہے۔ دلچسپی قائم رکھنا اس کے لئے ضروری ہے چاہے وہ تصویر خیال
اور جذبوں کے خطوط کے ذریعہ ہو یا تصوف اور اخلاق کے مسائل کے
شگافوں سے یورپ میں ناول کو ادبیات میں اٹھارہویں صدی سے
جگہ ملی ہے اور انیسویں صدی میں یہ وصف ہمارے ادب میں آگئی۔ اب اس
سے جو کام لیا جاتا ہے وہ کسی اور طرح ممکن نہیں یہ زندگی کی تصویر
بھی ہے اور تفسیر بھی خواب جوانی کی تعبیر بھی ہے اور سب سے بڑھ کر تنقید
بھی یا ڈرامہ یا مضمون سے زیادہ مکمل ہے۔ مضمون نگاری زندگی
کے متعلق اظہار خیال کرنا ہے۔ ڈرامہ زندگی کو شعلے کی لپک اور لہو
کی دھار بنا کر پیش کرتا ہے مگر ناول سے زندگی کے چہرے سے نقاب
اٹھاتا ہے۔ زندگی کو دیکھنے کے بعد سے دوسروں کو دکھانا بھی
ناول نگاری کا حق ہے۔

ناول میں زندگی کے مختلف تجربات اور مناظر ہوتے ہیں واقعات کا
ایک سلسلہ ہوتا ہے پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور فلسفہ زندگی کی جھلک

ہوتی ہے۔ ہر ناول ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے اور فطرت انسانی
سے پردہ اٹھانے کی ایک بیدار کوشش، ناول لکھنے کے لئے بڑی پختگی
اور تجربے اپنے ہوئے شعور کی ضرورت ہے تبھی تو ایک نقاد کے
نزدیک یہ ایک حکیمانہ اور فلسفیانہ کام ہے قصہ گوئی انسانیت
کی ابتدا سے ملتی ہے مگر ناول مہذب انسانوں کی ایجاد ہے سرمایہ دار کلاس
نے افراد سے دلچسپی پیدا کی اور اس دلچسپی سے ناول کو جنم دیا۔

انگریزی میں رچرڈسن اور فلڈنگ ناول کے موجد کہے جاتے ہیں ہمارے
یہاں نذیر احمد کی کہانیوں کو ناولوں کا اولیں نمونہ کہا جا سکتا ہے
اگرچہ یہ مکمل نمونہ نہیں پھر بھی ہم آسانی سے نذیر احمد سے پہلے قصے اور ان کے بعد کے قصوں
سے الگ کر سکتے ہیں بعد کے قصوں میں ناول کی چند خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ نذیر
احمد کا تصرف ہے مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی اس کے چند ہی سال بعد
اعظم گڑھ کے قیام کے زمانہ میں توبۃ النصوح لکھی گئی نذیر احمد کی یہ
دونوں کتابیں شائع ہو چکی تھیں کہ ۱۸۷۸ء میں فسانۂ آزاد پہلے اودھ
اخبار میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔

نذیر احمد کی کہانیاں تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے
لکھی گئی تھیں یہ شروع سے مقصدی تھیں اور اصلاحی ان کہانیوں میں پلاٹ
مکمل اور واضح ہے ابتدا وسط اور تکمیل کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ قصہ
رفتہ رفتہ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے مگر اشخاص قصہ جامد ساکن معلوم
ہوتے ہیں اصغری شروع سے نیک اور سعادت مند ہے اکبری اس کی ضد
ہے محمد عاقل اور محمد کامل کا رول کو جو حصہ قصہ کے شروع میں مل گیا وہ
اسے آخر تک نبھاتے ہیں ہر کردار پہ ایک لیبل لگا ہوا ہے اور نام

میں علامتی رنگت ہے۔ نصوح، فہمیدہ، عاقل، فطرت، ظاہر دار بیگ،
جیلا، صادقہ اسی طرح کاغذ پر آتے ہیں جس طرح منروا جیوپیٹر کے سر سے
برآمد ہوئی تھی ان میں ترقی پذیری نہیں ہے۔ نذیر احمد کی کردار
نگاری کے گُر سے پوری طرح واقف نہیں ان کے کردار فرشتے ہوتے ہیں
یا شیطان۔ نذیر احمد کا تعارف انہیں زندہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے عمل سے
زندہ نہیں رہتے۔ نذیر احمد سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر وہ مقصد نہیں بھول سکتے
جس کے تحت وہ قصہ لکھتے ہیں ان کے ناول جتنے اچھے وعظ ہیں اتنے اچھے قصہ
نہیں وہ قصہ کو آزاد نہیں چھوڑ سکتے اور خود اس میں جابجا دخل انداز
ہوتے ہیں۔ وہ راہبانہ زندگی کے زیادہ قائل ہیں مگر ماحول کی مصوری
ان کے یہاں بہت اچھی طرح کی گئی ہے۔ اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی
خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی جو تصویریں نذیر احمد نے کھینچی
ہیں وہ ایسی سچی اور بےلاگ ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ان
کے قلم میں بلا کا زور اور جوش ہے اس کی وجہ سے ان کی کہانیاں اب بھی
مقبول ہیں اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

مراۃ العروس اور توبۃ النصوح الماریوں میں محفوظ نہیں چھوٹے
بڑے بوڑھوں کے دلوں میں محفوظ ہیں یہی ان کی ابدی زندگی کی ضمانت
ہے اخلاقی اور اصلاحی ہونے کے باوجود وہ دلچسپ ہیں اور مقصدی
ہونے کے باوجود زندہ۔

اسی زمانہ میں سرشار نے قصے لکھنے شروع کئے اور بہت لکھے سرشار کو قصہ
لکھنے کی تحریک اودھ پنچ کے تفریحی مضامین سے ہوئی مگر عجیب بات یہ ہے کہ
جس طرح نذیر احمد کی اولین تصانیف توبۃ النصوح و مراۃ العروس انکی

شہرت کا باعث ہیں اسی طرح فسانہ آزاد جو سرشار کا پہلا طبع زاد نتیجہ ہے
اپنے مصنف کا نام زندہ رکھنے میں کامیاب ہے سرشار فسانہ آزاد
کی وجہ سے زندہ ہیں دوسری تصانیف سرشار کی وجہ سے لوگوں کو یاد
ہیں فسانہ آزاد بھی ناول کی تعریف پر پورا نہیں اترتا اگرچہ اسکا مصنف
اسے ایک ناول کہتا ہے اور میاں آزاد کا ہر شہر دیار میں جانا اور وہاں
کی بری باتوں پر جھلانا ناول کا پلاٹ بناتا ہے یہ ایک آزاد فسانہ ہے
اس پیمانہ کوئی پلاٹ ہے نہ تسلسل اس کی کمزوری افسانہ نگاری کی کچھ زیادہ
تسلی بخش نہیں زبان بھی کچھ کچھ مصنوعی اور جدید ہے شاعرانہ ہو گئی ہے
اور قصہ بے طرح لمبا ہوتا چلا گیا ہے اور اکثر خلاف قیاس واقعات بھی داخل
ہو گئے ہیں پھر بھی اس میں ماحول کی اچھی والی تصویریں ہیں جنہیں سرشار نے اپنی
آنکھیں کھول دیں کو سرشار کی آنکھوں نے دیکھا تھا آرنلڈ بینٹ نے کہا ہے کہ
تین چیزیں ناولسٹ کو مہر لکھنے کے لئے کافی ہیں اس کا دائرہ عمل ہیں اپنی اشتال آپ ہیں
ان کو لکھنو اور اس کے گرد و نواح کی سوسائٹی سے عشق ہے وہ بمبئی میں ہوں یا قسطنطنیہ
میں لکھنو کی فضا پیدا کرنے سے باز نہیں رہتے تیسرا نگاری سے انہیں کوئی لگاؤ
نہیں اور نہ سیرتوں کے تنوع سے وہ معاشرت کی تصویر بنانا جانتے ہیں انہیں تو
کارٹون اچھے بنانے آتے ہیں انکی ظرافت ان کی سب سے ممتاز خصوصیت ہے اس ظرافت
کا سب سے اچھا نمونہ تو خوجی ہے مگر بدولت اللہ رکھی ہیرا میں بھی اسکی نیرنگیاں پیدا
گئی ہے نوابوں کے دربار اور بیگمات کی زبان سرشار کے خاص مضمون ہیں
یہاں ان کا قلم خوب جوہر دکھاتا ہے ظرافت کی وجہ سے لمبے لمبے اور اکثر خلاف
قیاس مکالموں کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے سرشار اپنے پڑھنے والوں کو ہنسانے
کے لئے خود ہنستے ہیں وہ زندہ کو قہقہوں میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ وہ ایک تو دال

آمادہ تمدن پر طنز کرنے میں مگر اسکے دلدادہ بھی معلوم ہوتے ہیں ان کا طرز نثر اردو کے
ارتقاء کے لحاظ سے نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے یہ فسانہ آزاد کی ترقی یافتہ
صورت ہے وہ نذیر احمد کے مقابل میں داستانوں سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں
مگر انکی غلامی اور ماحول کی مصوری انہیں نذیر احمد سے بڑا ناولسٹ بناتی ہے
سرشار کے نام کے ساتھ شرر کا نام آنا ضروری ہے ایک طرف سرشار کا موازنہ
رجب علی بیگ سرور سے کیا جاتا ہے دوسری طرف شرر سے شرر نے مضمون لکھے تاریخیں
لکھیں اور ناول لکھے مگر ملک میں وہ ایک ناول نویس کی حیثیت سے زیادہ مشہور
ہیں انہوں نے بیشتر تاریخی ناول لکھے ہیں ان میں جہاں تک پلاٹ کے ارتقا کا
تعلق ہے دلچسپی اور حسن ترتیب دونوں موجود ہیں شرر سرشار سے بہتر صناع ہیں
وہ جانتے ہیں کہ داستان کا ڈھانچہ کتنا ضروری ہے، وہ دلچسپی قائم رکھنا
ضروری سمجھتے ہیں کردار نگاری کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے شرر کو
اردو کا والٹر اسکاٹ کہا گیا ہے مگر اسکاٹ بہتر فن کار ہے شرر نذیر احمد کی
طرح اپنا تبلیغی مقصد نہیں بھولتے اور نہ انہیں جذبات پر اتنی قدرت ہے
جتنی اسکاٹ یا نذیر احمد کو۔ اسکاٹ جس ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے وہ جیتا
ہے بول اٹھتا ہے شرر کے عربی سپاہی ہندوستانی جذبات سے متاثر ہوتے ہیں اور
صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا صرف نام عربی ہے شرر کے سب ہیرو یکساں ہیں ان میں
کوئی بھی انفرادی خوبی نہیں ہے سب بہادر نیک دل اور حسین ہیں شرر کا خیال ہے کہ
عورتوں کے نزدیک مردوں میں بھی یہی خوبیاں ضروری ہیں فطرت کی بھول
بھلیاں اور جذبات کی گہرائیاں شرر کے بس کی نہیں ہیں۔ ایک زیادہ حسین محمود
اور عزیز میں کوئی فرق نہیں دوسری طرف ورجنا، انجلینا یکساں ہیں۔ صرف
موہنا میں ایسی دل آویزی موجود ہے کہ وہ المیہ (TLAPEOG) کی ہیروئن

کہلانے کی مستحق ہے ادبیات میں اسکے مقابلے کی چند ہی عورتیں مل سکتی ہیں الموڈی
کی ہمشیرہ 'زہرہ' عشق کی ہیروئن اور شالمثانی کی اپنا کر لیا LANACRAN HAI
میں تو سیرت کی بلندی اور ارادہ کی پختگی اور عشق کی حرارت ہے وہی سو شائیں
ہے میرے خیال میں شرر کے بہترین ناول فردوس بریں اور منصور موہنا ہیں شرر دراصل
جرنلسٹ ہیں اگر ان کے یہاں گہرائی اور واقعیت زیادہ ہوتی تو وہ بہتر ناول نگار ہوتے۔
شرر کے ساتھ ساتھ اودھ پنچ کے اسکول کے ناول بھی قابل ذکر ہیں سجاد
حسین نواب آزاد اور محمد الابرشاد برق کے تراجم اردو ناولوں کی تاریخ میں اہم
ہیں لیکن اس مختصر صحبت میں ان کا تفصیل سے ذکر کرنا ناممکن اور نامناسب
ہے حکیم محمد علی کے تاریخی ناول بھی تاریخی اعتبار سے کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں
انہوں نے شرر کے طرز پر تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے مگر ناول کو آگے نہ
بڑھا سکے۔

قصہ مختصر اب تک ناول زیادہ تر قصہ کہانی کے چکر میں رہے آگے نذیر
احمد نے اصلاح سرور نے طنز اور شرر نے تبلیغ کا کام لیا اودھ پنچ والوں نے
قدامت کی طرف جدیدیت کو روکنے کی آخری کوشش کی، لیکن زمانے نے
انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ زبان کے لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ ادبیت
نذیر احمد کے یہاں ہے، سرشار کی تصانیف صحرائی مناظر کی طرح ہیں جہاں
جہاں خوبصورت قطعے اور نہایت بدنما کہیں گڑھے ملتے ہیں شرر کا انداز بیان
اگرچہ انگریزی سے متاثر ہے مگر کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔
مرزا رسوا کے ناولوں سے ایک نیا رنگ شروع ہوتا ہے "امراؤ جان
ادا" "شریف زادہ" "ذات شریف" کا مصنف جدید رنگ کا پہلا ہے جس نے تاریخی ناولوں
کو چھوڑ کر حقیقت نگاری کو شعار بنایا، انہوں نے اپنے ناولوں کو اپنے

زمانہ کی تصویر سے بچا لیا یا معاصرہ کی زندہ سے بلا ث اخذ کئے اور چند
معمولی شخصیتوں کو لے کر ان کی عظمت اور دلآویزی کا احساس دلایا
رسوا نے فطرت انسانی کا غائر مطالعہ کیا ہے ان کا طرز تحریر صاف واضح
اور رواں ہے انہیں خود اپنے ناولوں کے عمدہ ہونے کا احساس ہے
ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ہمارے ناول نہ ٹریجیڈی ہیں نہ کامیڈی نہ ہمارے ہیرو تلوار
سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں کسی نے خودکشی کی ہے نہ زہر ہوا ہے
نہ وصل ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے
بقول ایک فاضل کے امراؤ جان ادا ایک دلچسپ قصہ جسکی زبان
دلی میں انکی لکھی ہوئی ہے اور انداز بیان نہایت دل نشیں ہے اس
قصہ میں ایک ایسا حسن انتظام اور اس کی تعمیر میں ایسا توازن ہے جو کم
از کم اردو ناولوں کو نصیب ہے رسوا پہلے ناول نویس ہیں جو معلم اخلاق ہونے
کے علاوہ فنکار بھی ہیں اور فن میں ضبط و نظم اور ڈرامائی احساس کے
قائل ہیں۔

اب ہم اس زمانے میں آتے ہیں جب نئی نسل کبھی ادب لطیف کے ذریعہ
کبھی نیچرل نظموں کے پیرایہ میں کبھی قومی اور اخلاقی سرمایہ سے اردو ادب
کو مالا مال کر رہی تھی، راشد الخیری کے ناول عورت کی مظلومیت کی
داستان ہیں مگر ان کے اصلاحی جذبہ ان کے تبلیغی انداز ان کے
خطابت۔ ان کی جذباتیت، ان کی اکتا دینے والی یکسانیت راشد الخیری
کو اس میدان میں کوئی بڑا مصنف نہیں بننے دیتی ادب لطیف کے
علمبرداروں نے جہاں کہیں حسن منظر اس کی پیشکش کی انہوں نے ناول

بھی لکھے مگر دراصل وہ انشا پرداز تھے ناولسٹ نہ تھے۔

پریم چند اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں انہوں نے اُردو ناول کو اچھی خاصی وسعت عطا کی بازار حسن، چوگان ہستی، گوشہ عافیت، پردہ مجاز، نرملا، غبن، میدان عمل اور گئودان سب دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان میں گئودان اور گوشہ عافیت سب سے بہتر ہیں چوگان ہستی کا پہلا حصہ کامیاب ہے مگر دوسرا ضرورت سے زیادہ طویل۔

یوں بھی پریم چند کے ناول ذرا زیادہ ہی لمبے ہو جاتے ہیں۔ اب تک جتنے ناول نکلے وہ زندگی کے ایک گوشہ کی تصویر بنانے پر قانع تھے۔ پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات۔ وہ ایک اچھے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے وہ یہیں کے مال سے اپنی دکان سجاتے ہیں۔ مقامی رنگ، مقامی خصوصیات ان کے یہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں۔

وہ انسانی فطرت کو جانتے ہیں۔ اگرچہ نفسیات انسانی کی گہرائیاں ان کے بس کی نہیں، ان کا مشاہدہ تیز و قوی ہے اور انہیں کرداروں کا پیدا کرنا اور انہیں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دینا خوب آتا ہے۔ ان کی حقائق نگاری میں شعریت [illegible] ہے اور ایک بے تابی ایک آوارگی بھی جھلکتی ہے جو آرنلڈ بینٹ کی یاد دلاتی ہے۔

وہ شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ ان کا ایک تصور حیات ہے۔ وہ غریبوں اور مظلوموں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں۔ کسانوں کے جذبات اور دیہاتی زندگی کے مرقعے ان کے یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ جہالت، غربت اور دقیانوسی رسم و رواج کا بھوت۔ دولت کی غلط تقسیم، مذہب کے نام پر انسانیت کا خون پریم چند

سے دیکھا نہیں جاتا، وہ نہایت شریف آدمی ہیں اور بعض حقائق کی تاب نہیں لا سکتے اور وہ مرد و عورت کی محبت کو بیان نہیں کر سکتے۔ ان کے یہاں جذباتیت زیادہ ہے ان کے یہاں کرداروں میں بہت جلد انقلاب آتا ہے، پریم چند کا خیال یہ ہے کہ انسان کی فطرت بالکل سفید ہوتی ہے نہ بالکل سیاہ اس میں دونوں کا عجیب اتصال ہوتا ہے۔ اگر حالات گرد و پیش اس سے موافق ہوئے تو فرشتہ بن جاتا ہے اور نہ موافق ہوئے تو شیطان، وہ حالات مذکور کا محض ایک کھلونا ہے مگر پریم چند ایک تصور حیات رکھتے ہیں، وہ زندگی بھول بھلیاں دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے، بلکہ ان میں سے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی مصلحانہ کوششوں کو بعض انقلاب پرست اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ان کا خیال ہے کہ پریم چند اس خلیج کو پاٹنا نہیں چاہتے جو امیر اور غریب کے درمیان ہے اسے کم کرنا کافی سمجھتے ہیں بعض کے نزدیک ان کے ناول افسانوں کی مالا ہیں، ان میں قدرتی وسعت پھیلاؤ اور نمو نہیں پھر بھی انہوں نے ادب کو بعض اچھے کردار دیئے ہیں۔

ہوری، دھنیا، سورداس سمن ہونے، نرملا، گیان شنکر ان کے غیر فانی کردار ہیں، یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں افراد کی فتح و شکست نہیں ہوئی بلکہ وہ بامقصد کی فتح و شکست ہوتی ہے پریم چند کی زبان ناہموار ہے، فارسی کے فقروں کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور ہندی لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آتے ہیں بایں ہمہ ان کا طرز سادہ، عام فہم اور پر زور ہے، سادگی میں جوش پیدا کرنا ان کا کمال ہے۔

پریم چند کے اثر سے اُردو میں افسانہ نگاری اور ناول کو ترقی ہوئی مگر ابھی ہمارے ناول مغربی ناولوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں ناول لکھنے کے لئے جس گہرائی مسحن ترتیب، تعمیری صلاحیت اور وسعت کی ضرورت ہے وہ

ہمارے یہاں ابھی نہیں. ابھی تک ہماری حقیقت نگاری فوٹوگرافی اور ہماری خیال آرائی داستان گوئی ہے. ہاں ترقی پسند تحریک نے زندگی اور ادب کے متعلق جو بصیرت پیدا کی ہے، اس کے اثر سے ناول اور افسانہ کی دنیا میں اضافہ ہوا ہے ۳۵ ۱۹ء سے ۱۹۴۳ء تک افسانوں کی کثرت رہی اب اچھے اچھے افسانہ نگار ناول کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں، سجاد ظہیر کا ناولٹ لندن کی ایک رات کرشن چندر کی شکست عزیز احمد کا گریز اور عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر یہاں قابل ذکر ہیں ان سب ناولوں مغرب کا اثر ہے خصوصاً گریز اور ٹیڑھی لکیر پر موجودہ انقلابی دور میں زندگی کی اچھی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور نئی قدروں کو ابھی جاگزیں ہونے کا موقع نہیں ملا، اس وجہ سے ادب میں وہ پختگی وہ گہرائی نہیں جو بڑے ادب کی تخلیق کے لئے ساز گار ہو، اُردو میں یوں بھی نثر کی عمر نظم سے بہت کم ہے، نثر کو جو ترقی اس زمانہ میں ہوئی ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں اگلا دور ناول کا دور ہوگا.



اُردو نثر میں مزاحیہ نگاری

کتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پٹنا پسند کرتے ہیں مگر یہ گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی ان کے اوپر ہنسے۔ یہی حال انسانوں کا ہے انہیں ضرب شدید پسند ہے چاہے اس کا نتیجہ جنت ہو یا حوالات۔ مگر مضحکہ خیز بننا پسند نہیں۔ انسانوں کی اسی کمزوری سے مزاحیہ نگاری نے فائدہ اٹھا لیا ہے۔

نثر اُردو میں مزاحیہ نگاری کا آغاز دراصل اودھ پنچ سے ہوتا ہے جو مشہور انگریزی اخبار پنچ کے نمونہ پر جاری کیا گیا تھا مگر پنچ سے پہلے بھی ہمیں مزاحیہ نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی میں سب سے زبردست ادبی شخصیت غالب کی ہے ایک وقت میں یہ بہت بڑے شاعر بہت بڑے انشا پرداز بہت بڑا ظریف اور بہت بڑا انسان تھا۔ ظرافت غالب کی جزو غالب تھی اور اسی بنا پر حالی نے انہیں حیوان ظریف کہا ہے غالب کے خطوط میں ظرافت کی پاکیزہ اور سنہری مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ تعزیت ہو یا دوستوں کے کلام کی اصلاح آپ بیتی ہو یا جگ بیتی، ادبی مثالیں ہوں یا شاعرانہ شوخیاں دنیا جہاں رو رہی یا بسور رہی ہے وہاں غالب صرف مسکراتا ہے جدت طرازی، اور بات میں بات پیدا کرنا غالب کا حال تھا وہ صرف دوسروں ہی پر نہیں اپنے پر بھی ہنس سکتے تھے۔ وہ قہقہہ کے قائل نہیں۔ صرف زیر لب مسکراتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ

اردو کے اڈیشن ہیں، اڈیسن زندگی کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اس کا دلکش رواں اور متبسم طرز انگریزی نثر کی معراج ہے۔ غالب تماشائی نہیں، خود تماشا ہیں۔ گہرے اور تیز چھینٹوں کے بجائے دونوں ہلکے رنگوں کی آمیزش سے اپنی تصویر بناتے ہیں۔

غالب کے خطوط ۱۹۶۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ نذیر احمد کی مراۃ العروس بھی اسی دل بھی۔ نذیر احمد کے طرز میں بھی ظرافت پائی جاتی ہے، یہ ظرافت بڑی بلیغ ہے اور ایک جملہ سے آدمی گھنٹوں تڑپ لے سکتا ہے مگر نذیر احمد مزاحیہ نگار نہیں، مزاحیہ نگاری ۱۸۷۷ء سے شروع ہوئی جب بقول چکبست اودھ پنچ نے زبان و ظرافت کے چہرے سے نقاب اٹھائی، اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے آپ نے ۳۶ برس تک اس اخبار کے ذریعہ سے ادب اور انشا کے پھول کھلائے، ان کے رفیقوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا چھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، مولوی عبد الغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، سید اکبر الہ آبادی مولوی احمد علی کسمنڈوی کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے اودھ پنچ کی اشاعت کے وقت ان لوگوں کو کوئی جانتا بھی نہ تھا ان سب کی شہرت اودھ پنچ، اخبار کے ذریعے ہوئی ان کی ظرافت منشی سجاد حسین کے اثر سے چمکی سجاد حسین کا ناول حاجی بغلول یا بغلول یا احمق الدین پڑھیے تو آپ کو (PICKWICKERS) کا لطف آئے گا، گلیڈسٹن اور نظام حیدرآباد کے نام ان کے خطوط دیکھیے تو آپ کو معلوم کہ سیاسی مسائل بھی ظرافت کی چاشنی کیسے پیدا کی جاتی ہے لوکل علیہ الرحمتہ کے نام سے ان کے جو مضامین نکلتے تھے ان میں موسم پر کچھ اس انداز سے تبصرہ ہوتا تھا کہ لوگ اگلے نمبر کے

منتظر رہا کرتے تھے۔ سجاد حسین باغ و بہار آدمی تھے انہوں نے اودھ پنچ کو اس زمانہ کا سب سے ہر دلعزیز پرچہ بنا دیا تھا۔ پنچ کی ظرافت کا میدان معاشرتی و سیاسی تھا۔ معاشرتی نقطہ نظر سے پنچ قدامت کا پیرو اور سیاسی نقطہ نظر سے جدیدیت کا حامی تھا۔ مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں اودھ پنچ نے اپنی کوشش صرف کر دی مگر اس کے ساتھ وہ آزادی ہند کا حامی اور کانگریس کا طرفدار تھا۔ پنچ کے چھیڑ چھاڑ سے کم لوگ محفوظ رہتے ہونگے حالی، داغ، شرر اور سرشار کے خلاف پنچ نے کیا کچھ لکھا۔ ان مضامین ادبی خوبی ہو یا نہ ہو ظرافت ضرور ہے۔

پنچ کے مضمون نگار خود ہنستے ہیں اور اپنی ہنسی سے دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ ان کی طنز میں تیزی ہے، مگر زہر ناکی نہیں۔ ان کی زبان میں لکھنؤ کی پر تکلف مگر پر لطف زبان ہے۔ لوگ زندگی کی رنگینی اور دلچسپی سے دل کھول کر لطف اٹھاتے ہیں۔ شاید اسی لئے دنیا میں آئے تھے ہر محرم ان کے نزدیک میلہ تھا اور ہر موسم راگ و رنگ کا بہانہ۔ سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزاد کا بھی ایک خاص طرز تھا۔ آپ نے لندن سے جو خطوط لکھے ہیں، ان میں پرانی اور نئی روشنی کے فرق کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔

پنچ کے اس رنگ کو فتنہ اور عطر فتنہ نے قیامت کر دیا۔ ریاض کی شوخی اور چلبلی طبیعت نظموں اور غزلوں کے علاوہ نثر میں بھی اپنی بہار دکھاتی ہے مگر یہاں بھی ظرافت کے معنی خوش طبعی کے ہیں۔ تلخی اور تیزی کے بجائے لطف شیرینی ہے پنچ جدید تہذیب کے علمبرداروں کو چھیڑتا ہے مگر فتنہ کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے یہ حسینوں کو اس لئے چھیڑتے ہیں کہ ان کی گالیوں میں انہیں مزہ ملتا ہے۔

ادھر پنج ادرفتنہ کا دور ختم ہو رہا تھا، ادھر نئی تہذیب کے قدم رفتہ رفتہ جم رہے تھے اور اس کی کوشش بار آور ہو رہی تھی چنانچہ اب جن مزاحیہ نگاروں کے نام آتے ہیں وہ قدیم و جدید کے درمیان کی کڑی ہیں، اس دوسرے دور میں اگرچہ بہت سے آدمیوں نے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں، مگر مزاحیہ نگار صرف تین ہیں۔ سید محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوش تینوں کا نقطۂ نظر ایک ہے، تینوں علی گڈھ کے پرانے گنہگار، قدامت کے پرستار جدیدیت کے دشمن ہیں مگر تینوں کا مشاہدہ چونکہ تیز ہے اس لئے جہاں کہیں افراط و تفریط یا نشیب و فراز ملتے ہیں ان کے مضحکہ خیز پہلو دکھانے سے نہیں چوکتے سید محفوظ علی کو کم لوگ جانتے ہیں، آپ نے اپنے نام سے کبھی کوئی مضمون نہیں لکھا بلکہ ہمیشہ "انڈار در" سے پہنچائے گئے ہمدرد میں ہی تجاہل عامیانہ کے نام سے نقیب میں ملا بودھاموٹی کے نام سے علی گڈھ میگزین میں شمع بے نور کے نام آپ کے مضامین نکلے ہیں۔ الناظر پریس سے ایک مختصر مجموعہ انتخاب نقیب کے نام سے آپکے چند مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کا ادبی پایہ بہت بلند ہے، شیخ سمار اللہ خاں کی صاحبزادیاں یا صاحب دین ظرافت کے بلند ترین نصب العین پر پورے اترتے ہیں انہیں پڑھ کر کوئی قہقہہ نہیں لگاتا بلکہ ہنستا بھی نہیں مگر ان میں وہ تازگی شگفتگی اور نفاست ہے کہ روح میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے مگر اول تو مضامین کا عالمانہ اور چپا تلا انداز بیان دوسرے مصنف کی اپنے آپ کو پردوں میں رکھنے کی کوشش یہی وجہ ہے کہ لوگ ان مضامین سے زیادہ واقف نہیں ظفر علی خاں اور سید محفوظ علی ایک ہی زمانہ کے ہیں دونوں نے ساتھ پڑھا ہے اور برسوں ساتھ رہے ہیں مگر دونوں میں نقطۂ نظر ایک ہونے کے باوجود بڑا فرق ہے محفوظ علی مزاح نگار ہیں اور ظفر علی خاں

طنز نگار اور آپ جانتے ہیں طنز و ظرافت ایک دوسرے سے کتنے قریب ہونے پر بھی کتنے دور ہیں۔ ظفر علی خاں اچھے شاعر اچھے نثر نگار اچھے مقرر۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اچھے جرنلسٹ ہیں یہی ان کی سب سے بڑی خوبی اور یہی ان کی سب سے بڑی خامی ہے وہ شعر پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کے چشمے ابل رہے ہیں، تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تلوار ہے جو دائیں بائیں دونوں طرف تھرادر کرتی جاتی ہے، وہ بہت جلد لکھتے ہیں اور بڑا اچھا لکھتے ہیں اپنے شعور فنی تک پہنچنے اور اپنے طنز کو پختہ کرنے کے لئے انہیں بہت ریاضت نہیں کرنا پڑتا مگر چونکہ وہ جرنلسٹ ہیں اس لئے ان کی تحریروں میں ابدیت نہیں سیاسیات کی دنیا میں قدروں کا احساس نہیں رہتا۔ آج ایک چھوٹے سے ان فائدے کے لئے کل کا بڑا نقصان گوارا کر لیتا سیاسی آدمی سے بعید نہیں ظفر علی خاں کی ساری زندگی مار کرنے اور دار سہنے میں گذری ہے اس کی وجہ سے ان کی شخصیت دلچسپ ہو گئی ہے۔ مگر اس لڑائی اور ان پینتروں سے آنے والی نسلوں کو بھی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

سلطان حیدر جوش کا میدان دوسرا ہے، یہ علی گڑھ کے پرانے کھلنڈرے اور جہل مرکب کے پیرو ہیں علی گڑھ کی افتاد زندگی ایک زمانے میں بڑی دلچسپ ہوتی تھی، نہ معلوم کیوں اس نے جہل مرکب کا نام اختیار کیا اس کا سب سے اچھا نمونہ ولایت علی بمبوق کے مشہور مضمون پہواری میں ملتا ہے۔ بہر حال شوخی شرارت مذاق کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا امتزاج سلطان حیدر جوش کے مضامین اور افسانوں میں جھلکتا ہے، اگرچہ ان کے آرٹ میں تکلف زیادہ ہے۔

مزاحیہ نگاری کا تیسرا دور جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتا ہے اس میں

سرفہرست فرحت اللہ بیگ، پطرس اور رشید احمد صدیقی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین سات حصوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان کی شہرت کا دار و مدار نذیر احمد کی کہانی ایک یادگار مشاعرہ اور پھول والوں کی سیر پر ہے ان کی ظرافت زبان کی چاشنی اور انداز بیان کی سادگی سے بنی ہے۔ نذیر احمد کی کہانی قطعی غیر فانی ہے اس کے پڑھنے سے جہاں نذیر احمد کی شخصیت اور عظمت کا احساس ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک انسان کی تصویر ہے اور ایک ایسے مصور نے بنائی ہے جو رنگوں کی آمیزش میں مہارت رکھتا کچھ ہمدردی کچھ خلوص اور کچھ سوجھ بوجھ یہ تینوں چیزیں اگر جمع ہو جائیں تو مشاہیر کی قلمی تصویریں بڑی کامیاب ہو سکتی ہیں۔ نذیر احمد کی کہانی میں سب کچھ موجود ہے آخری وصت وحید الدین سلیم کی قلمی تصویر ہے اور اس میں وہی بات ہے جو نذیر احمد کی کہانی میں یعنی یہاں بھی مصنف ان دونوں اشخاص کی عظمت سے متاثر ہے مگر مرعوب نہیں، ان مضامین کی کامیابی کا یہی راز ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کے طرز پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محاوروں کی بھرمار ہے، یہ اعتراض فرحت اللہ بیگ پر وارد ہو سکتا ہے۔

فرحت اللہ سراسر مشرقی ہیں اور پطرس کا خیال خندہ آور ہوتا ہے، شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایسی پہلو دوہوتی ہے کہ اس کے دل میں جنون عشق سے آشنا ملنے لگتے ہیں مگر اچھا طنز نگار ہر معمولی اور پیش افتادہ چیز میں بھی کوئی مضحکہ خیز پہلو دیکھ لیتا ہے پطرس کی ظرافت کا کمال یہی ہے انہوں نے مغربی ادب کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ قدامت کے پجاریوں یا نئی تہذیب کے پرستاروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اس قسم کی تنقید کی عمر زیادہ نہیں ہوتی وہ ایسی ہی چیزیں لیتے ہیں جو ہر وقت اور ہر موقع پر دلچسپی

پڑھی جا سکتی ہیں، مضامین پطرس اٹھائیے، پہلا جملہ یہ ہے "اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرایا ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں اپنے پیسوں سے خریدی تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں" دیکھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جملوں کو لکھنے والا خود نہیں ہنستا مگر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے کہ یہاں آپ کی ذہانت طباعی نیز مشاہدہ تخیل سب کی کارفرمائی عجیب انداز سے ملتی ہے پطرس نے بہت کم مضامین لکھے ہیں مگر پھر بھی وہ ہمارے چوٹی کے مزاحیہ نگاروں میں ہیں اتنا کم سرمایہ لے کر بقائے دوام کے دربار میں کم لوگ داخل ہوئے ہوں گے "کتے" "بچے" اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" "بائیسکل" "لاہور کا جغرافیہ" یہ مضامین زندہ رہنے والے ہیں خصوصاً کتے والے مضامین کا جس قدر تتبع کیا گیا ہے وہ اس کی کامیابی کا ثبوت ہے، پیروڈی کو پطرس نے اردو میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

رشید احمد صدیقی پطرس اور فرحت اللہ بیگ دونوں سے مختلف ہیں یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو قدامت پسند یا جدیدیت پسند نہیں کہہ سکتے ان کا ایک قدم یہاں اور ایک وہاں ہے یہ REPARTEE اور PARADOX دونوں کے ماہر ہیں اس لحاظ سے اردو کے چسٹرٹن بھی ہیں اور برنارڈ شاہ بھی پطرس اپنی ظرافت کے لئے خام مواد زندگی سے لیتے ہیں فرحت اللہ بیگ مردوں سے اور رشید احمد صدیقی علی گڑھ شعر وادب سے، یہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور ان کے مضامین میں علی گڑھ کی اقامتی زندگی کا عکس جابجا ملتا ہے مقامی رنگ کے ساتھ ادبی چاشنی اس قدر ہوتی ہے کہ رشید احمد صدیقی کے

مضامین سے صرف خواص ہی لطف لے سکتے ہیں ان کے مضامین کا ایک مجموعہ
مضامین رشید اور ریڈیو والی تقریریں خنداں کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔
رشید احمد صدیقی کے یہاں ظرافت کی جان طنز ہے وہ اکبر کے پیرو ہیں اور
ان آزاد بھی۔ جس طرح اکبر کے یہاں بعض مخصوص علامات ہیں اسی طرح
رشید احمد صدیقی آئی، سی، ایس، روشن خیال بیوی مرشد، حاجی بلغ العلی
پولیس، ارہر کے کھیت سے خاص کام لیتے ہیں وہ جزئیات پیش نہیں
کرتے چند گہرے، اور شوخ رنگوں سے اپنی تصویر بناتے ہیں یا دل اٹھتے
کی کیفیت دکھانا چاہتے ہیں تو زلف شب سے مدد لیتے ہیں بلکہ انگریزی
کے ڈریڈ ناٹ یا چماروں کی جوانی کا واسطہ دلاتے ہیں جدید دور کی
ذہنی زندگی دیکھنا ہے تو رشید احمد صدیقی کے مضامین پڑھیے یہاں
آپ کو مغربی تہذیب مغربی تعلیم دور حاضر کے اہم واقعات شعر و ادب کے
نئے انکشافات تعلیم یافتہ طبقے کے مشاغل سائنس کے نظریے آزاد خیالی
کے کرشمے، سب کی رنگارنگی ملے گی ارہر کے کھیت اور پارلیمنٹ کو ایک صف
میں لاکر کھڑا کرنا اور شاعر فلسفی اور مولوی کی گمراہیوں کو ایک نظر میں
دیکھ لینا رشید احمد صدیقی کا کمال ہے۔

جس طرح انگریزی ادب میں سوئفٹ کے یہاں طنزیاتی روح سب سے
زیادہ نمایاں ہے، اسی طرح اردو میں اکبر اور رشید احمد صدیقی اس لحاظ
سے ممتاز ہیں دونوں نے خون خرابے والی چیزیں لکھی ہیں یہ اور بات ہے
کہ اس پر خون خرابہ نہ ہوا ہو۔

چغتائی، شوکت، رموزی اور ایم اسلم اس زمانہ کے کامیاب مزاح
نگاروں میں ہیں ان سب کے مضامین اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے

ہیں چغتائی واقعات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں، شوکت زبان کی چاشنی سے فضا تیار کرتے ہیں، رموزی کی سوجھ بوجھ اچھی ہے۔ اسلم صرف ہنسوڑ ہیں چغتائی کے افسانوں کو پڑھ کر انگریزی مصنف (P. C. WOODHOUSE) کی یاد آتی ہے دونوں کی ذہانت اور طباعی میں کلام نہیں مگر دونوں کی بسیار نویسی ان کے حق میں کانٹے بوتی ہے شوکت بھی اس مرض میں گرفتار ہیں صحافتی زندگی ان کی طبعی شگفتگی سے اپنا خراج لے رہی ہے۔ چغتائی کا کوتا رشر بیوی اور انشد تری نہایت دل چسپ ہیں، شوکت نے سودیسی ریل بہت اچھی لکھی ہے۔ ملا رموزی شوکت اور اسلم تینوں کے یہاں ایک بڑی کمی ہے یہ تینوں اپنا یا اپنے گھر والوں کا اس طرح پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ طبیعت الجھنے لگتی ہے، یہ چیزیں چغتائی کے یہاں سب سے زیادہ ہیں، رموزی کے یہاں سوجھ بوجھ بھی ہے مگر نقالی زیادہ ہے ان کی علامات وہی ہیں جو اکبر نے عرصہ ہوا اب سے پہلے برتی تھیں وہ پانیر اخبار کو اب بھی جدید نسل کا صحیفہ الہٰی سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اخبار ہے اور نہ جدید نسل ہے جب وہ ناصحانہ رنگ اختیار کرتے ہیں اور روتے ہیں تو ان پر ہنسی آنے لگتی ہے اور ان کی ہنسی پہ رونا آتا ہے۔

ان اشخاص کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ ہیں جن کا اس سلسلہ میں ذکر کیا جا سکتا ہے یہ لوگ مزاحیہ نگار تو نہیں ہیں مگر انہوں نے بعض بڑی پرلطف چیزیں لکھی ہیں مولانا محمد علی کے مضامین جو جا بجا ظرافت کے چھینٹے ملتے ہیں حسن نظامی کی چٹکیاں لشر گدگدیاں بڑے مزے کی ہیں، مگر امتیاز علی تاج کی کتاب چچا چھکن خاص طور پر قابل ذکر ہے تاج کا ہیرو (J. JEREME) (WEREME) کے کردار کا ایک عکس ہے مگر تاج نے اس میں یہاں کی فضا

اور ماحول پیش کر کے اسے بالکل مشرقی بنا دیا ہے، اس عنوان پر بہت سے مضامین لکھے گئے مگر مولوی مدن والی بات کہیں نظر نہ آئی دوسری اہم کتاب مضامین فلک پیما ہے اس میں مذہب تہذیب، معاشرت، تمدن، شعر و ادب سب پر نہایت بیباک تنقید یں ہیں کوئی مشاق سرجن بھی اس طرح نشتر نہ چلاتا ہوگا جس طرح فلک پیما سوسائٹی کے فاسد مادہ پر نشتر زنی کرتے ہیں، یہ حسن کے بڑے ادا شناس ہیں اور ان کے انداز میں بڑا بانکپن اور گہرائی ہے۔ حال میں کنہیا لال کپور نے طنز میں خوب نام پیدا کیا ہے ان کے دوستوں نے انہیں بچھو سے تشبیہ دی ہے غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں ان کی کامیاب پیروڈی ہے۔ ان کے علاوہ اخباروں میں سرلر لپنے ذکا ہانت افکار و حوادث نظر سے خوش گذرے۔ بہت سے عنوانات مزاحیہ نگاری کی مقبولیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ غرض اس دور میں جہاں ایک طرف تخلیقی قوتیں نمودار ہو رہی ہیں وہاں نقالی فریب اور جعل بھی بہت ہے اور ان ہی کی افراط سے مزاحیہ نگار اپنے لئے خام مواد حاصل کرتا ہے وہ شاعر یا ناصح سے کم نہیں بلکہ ایک منزل وہ آتی ہے جہاں نصیحت یا شاعری بیکار ہوتی ہے۔ اس وقت مزاحیہ نگار طنز و ظرافت کے پردے میں زندگی کو سدھارتا یا سنوارتا ہے، اس کی تلخیوں اور مایوسیوں کو گوارا بناتا ہے اور اس میں وزن وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے۔

اکبر کے متعلق اقبال کا یہ قطعہ مزاحیہ نگار کے نصب العین کو کتنی اچھی طرح واضح کرتا ہے۔

سر ذرہ طور معنے کلیے
ہیے گریہ اوچول ابر بہارے

یہ بیت خانہ دور حاضر خلیلے
گیے خندہ او چوں تیغ اصیلے

(۱۹۲۵ء)

★

اُردو میں افسانہ نگاری

ہمارے ادب میں مختصر افسانے کی عمر ابھی زیادہ نہیں مگر حال ہی میں اس نے بڑی ترقی کی ہے اور ۱۹۳۶ء کے بعد سے افسانوں کے بعض اچھے مجموعے شائع ہوئے ہیں، جنگ عظیم سے پہلے سوائے پریم چند کے کوئی اول درجہ کا افسانہ نویس نظر نہیں آتا۔ اگرچہ بہت سے مصنف ادیب اور انشاپرداز افسانے بھی لکھتے تھے مگر وہ افسانے کو مختصر ناول سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے خود پریم چند جو درجنوں لازوال کہانیوں کے خالق تھے افسانہ نویسی کے گر سے پوری طرح واقف نہ تھے وہ قصہ کی ترتیب کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے تھے اور اکثر ادھر ادھر کی باتوں میں کہانی کا اصل مقصد بھول جاتے تھے مگر چونکہ وہ شدید احساس اور تیز نظر کے مالک تھے اس لئے ان کی نظر زندگی کے حقائق پر پڑ ہی جاتی تھی وہ براہ راست زندگی سے خام مواد تیار کر لیتے تھے افسانہ نگاری سے انہوں نے تنقید حیات کا کام لیا ان کے اوپر میتھیو آرنلڈ کا فقرہ صادق آتا ہے جو انہوں نے ایک یونانی ڈرامہ نویس کے متعلق لکھا تھا۔ انہوں نے زندگی کو اچھی طرح دیکھا اور پوری زندگی کو دیکھا۔

پریم چند ابھی کہانیاں ہی لکھ رہے تھے کہ اُردو میں ادب لطیف کا اثر شروع ہوا اور بہت جلد افسانے اس میں لکھے جانے لگے۔ نیاز فتحپوری، سجاد حیدر لطیف الدین احمد اکبر آبادی اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہیں، جو شراب و شعر میں ڈوبا ہوا تھا نگار اور آگرہ کے نقاد کے ابتدائی پرچے ایک خاص قسم کے جذباتی سیلاب کو ظاہر کرتے ہیں لیوپڈ و سائیکی، شاعر کا انجام کہکشاں کا ایک ساغر اور جمالی کے افسانے دراصل اتنے اچھے افسانے نہیں ہیں جتنے ایک خاص قسم کے انشار پردازی کے نمونے ہیں، وہ انشار پردازی جو ہر چیز کو آتش سیال ارتعاش رنگین اور آشوب خیال کے رنگ میں دیکھتی ہے اور جس کی وجہ سے زندگی کی تلخ حقیقتوں پر ایک نرم و نازک دھندلا دھندلا سا لگر پُرفریب پردہ پڑ جاتا ہے، انیسویں صدی کے آخر میں زندگی برائے ادب کا جو سنہرا نظریہ آسکر وائلڈ اور پیٹر نے انگلستان میں پیش کیا تھا، اس کا عکس اُردو میں ادب لطیف کے ان نمایندوں کے یہاں نظر آیا۔ اس میں خود پسندی ایک انانیت اور صناعانہ پختگی کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی تعیشی بھی ہے۔ یہ لوگ دراصل شاعر تھے جو افسانے کی سرحد میں آنہ او گھس آئے تھے۔ انہیں قصہ کی تنظیم اور کردار کے ارتقاد سے زیادہ دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے جنسی میلانات سے سارے ادب کو جذبات کی دلدل بنا دیا تھا۔ ابھی یہ رنگ عالمگیر نہ ہونے پایا تھا کہ مغربی افسانوں کے مطالعہ بیسویں صدی کے نئے نئے انقلاب اور پریم چند کے اثر سے افسانہ نگاری میں نئے رجحانات پیدا کر دیئے، افسانہ نگاری صرف تفریح نہ رہی وہ فریاد کی ایک لے بن گئی۔

مغرب میں افسانہ نگاری کے دو اسکول بن گئے تھے ایک مو پاساں کا

دوسرا چیخوف کا اُردو میں انگریزی کے واسطے سے ان دونوں کے بکثرت ترجمے ہونے سے چیخوف کا خاص طور پر اثر ہوا۔ کیونکہ اس کے کردار بالکل مشرقی معلوم ہوتے تھے ہو یا ساں کی حقیقت نگاری یہاں ناممکن تھی چیخوف کے یہاں بعض لوگوں کو ایک دھندلکا نظر آیا حالانکہ اس میں فارم کا احساس بھی موجود ہے اس کی روحانیت اور نفسیاتی تجربے نے ہمارے افسانہ نگاروں کو بہت متاثر کیا اور اس کا رنگ کئی طبیعتوں میں رچ گیا۔

ایک طرف ملک میں ان ترجموں کی وجہ سے ایک نئی وسعت ذہن پیدا ہو رہی تھی دوسری طرف پریم چند کے افسانے کا اثر ہو رہا تھا۔ پریم چند نے جو بیج بویا تھا اس سے جو پودے اگے انہیں زمین بھی اچھی ملی اور آب و ہوا بھی۔ چنانچہ ان کے اصلاحی رنگ سے متاثر ہو کر سدرشن، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، علی عباس حسینی، پروفیسر مجیب نے کامیاب افسانے لکھے۔ سدا بہار پھول، ڈالی کا جوگ، آئی سی، ایس کیمیا گر اب بھی دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں، انھوں نے اپنے المیہ افسانوں سے ابتدائے جوانی کے روحانی جذبات کو بہت متاثر کیا۔

یہ ماحول تھا جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ یہ اس قدامت پرستی سے بھی بیزار تھے جو اس دنیا کو چھوڑ کر "نورتنہ" میں پناہ لیتی تھی اور اس اصلاحی تحریک سے بھی ناخوش جو پریم چند جیسے نیک نیت اشخاص کے ہاتھوں دنیا کی مصیبت کم کرنے اور بوسیدہ لباس میں ادھر ادھر سے رفو کرنے پر قانع تھی اس بیزاری اور نفرت کا اظہار انگارے کی شکل میں ہوا۔ انگارے کے مصنفین نفسیاتی نقطہ نظر سے فرائڈ فنی نقطہ نظر سے جیمس جوائس اور معاشی نقطہ نظر سے کارل مارکس کے مقلد تھے۔

انگارے کے ذریعہ سے انہوں نے موجودہ سماج کو جلا کر خاک کرنے کی
کوشش کی کتاب کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور اسے ضبط کرنا پڑا اس کا
اثر جو معاصر ادب پر پڑا ہے حیرت انگیز ہے اسی کے اثر سے شعلے، محبت اور نفرت
منزل، انوکھی مصیبت، چنگاری، عورت اور اسی قسم کے بہت سے مجموعے
شائع ہوئے۔

رسالوں اور اخباروں میں پرانے رومانوں کی جگہ مزدوروں اور
کسانوں کی دل گداز داستانوں نے لے لی اور جسے دیکھئے فقیروں، قلیوں، بیماروں
اور مزدوروں کے ذکر کو افسانوں کیلئے ضروری خیال کرنے لگا۔ ترقی پسند ادیبوں
نے شروع میں حقیقت نگاری کی خاطر خیالات میں الجھن اور زبان میں ناہمواری
گوارا کی نفسیاتی تجزیہ کی غرض سے جنسیات کی دلدل میں کودنا منظور کیا ادب
کو محض رنگینیوں اور امیروں کا کھلونا دیکھ کر مزدوروں اور کسانوں کی گندگی
بے ایمانی اور اخلاقی پستی کو گلے لگا لیا۔ اس دنیا کو جلا کر خاک کر سکنے کے عزم
اور نفرت کی ایسی تیز آنچ پیدا کی کہ بعض اس میں یا تو خود جل گئے یا افسانوں
کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی مگر اردو افسانوں میں نئی زندگی انہیں ابتدائی
لغزشوں سے آئی۔

یہ سب ردعمل تھا پچھلے جمود اور تعیش کا اور ردعمل جب شروع ہوتا
ہے تو اس میں توازن کا احساس نہیں رہتا۔ جذبات کا طوفان حسن و عشق
افلاطونی محبت بے ثباتی دنیا یا تصوف کی بازیگری سے جو دیس آتا تھا وہ
غریبوں کی آہوں اور بیواؤں کے آنسو کی راہ بہنے لگا، جنسی رجحانات غزلوں
میں تو مردنی اور کثافت لائے مگر نام نہاد ترقی پسند افسانے نیم کالجیوں
اور عصمت فروشوں کی زندگی سے جو آب و رنگ کھینچا اور حقیقت

نگاری کے لیے ضروری ٹھہرا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ دراصل اس تحریک نے افسانہ نگاری کو آگے بڑھایا، مگر شروع شروع میں ہر تحریک کی طرح اس میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اور بہت سے افسانے معاشی یا سیاسی مقالے بن کر رہ گئے۔ احمد عباس کے شعلے پڑھئے تو اس میں آپ کو افسانے کی جگہ منتشر تاثرات نظر آئیں گے۔ اختر رائے پوری کی نفرت ان محبت سے بہتر جس کتاب کا پہلا حصہ مبہم ہو کر رہ گیا ہے دوسرے میں سماج کی خرابیوں پر بہت گہری اور پر اثر طنز ملتی ہے، یہ طنز زہرناکی حد تک پہنچ گئی ہے جس طرح سوئفٹ انسانیت کے زخموں کو کرید کر مزے لیتا تھا اسی طرح اختر جنسی اور اخلاقی پستی میں چھپتے اڈ انے نظر آتے ہیں۔ سردار جعفری کی منزل یا رشید جہاں کی عورت دونوں مجموعے فنی خامیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں قلادم کا احساس عام طور پر مفقود ہے اور ان کی نظر بہت گہری نہیں ہے بجز اس دور میں سب سے اچھی کہانیاں سجاد ظہیر کی ہیں۔ انگارے میں صرف وہی فنی نقطۂ نظر سے قابل احترام ہیں۔ ہاں پریم چند آخر وقت میں ترقی پسند ادب کے ہمنوا بن گئے تھے اور کفن ان کے اس دور کی بڑی اچھی نمائندگی کرتی ہے میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں۔ ایک نقش بھی دھندلا نہیں، شروع سے آخر تک چستی اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے پریم چند نے ایک مرتبہ تو حقیقت کو مردانہ وار دیکھا ہے۔

افسانے کی دنیا میں پریم چند کے بعد سب سے بڑی شخصیت کرشن چندر کی ہے کرشن چندر کے مجموعوں کی تعداد ایک درجن ضرور ہوگی۔ اگرچہ افسانوں کی تعداد کسی کی بھی پریم چند کے افسانوں سے نہیں بڑھی ان کے مجموعوں میں

ٹوٹے ہوئے" "زندگی کے موڑ پر" "ہم وحشی ہیں۔ اور "سمندر دور ہے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کرشن چندر کی مقبولیت کے کئی وجوہ ہیں ان کے یہاں رومان بھی ہے انسانیت بھی ہے زندگی کی تصویریں بھی ایک تندرست رجائیت بھی اور ایک دلدوز شعریت بھی ان کے جدید افسانوں میں ایک رنگین سیاسی شعور کی جھلک بھی ہے ان کے افسانوں پر اعتراض کئے گئے ہیں بعض وہ افسانہ نہیں مضمون لکھنے لگتے ہیں انہیں کردار نگاری کا زیادہ سلیقہ نہیں ان کی رومانیت ان کی حقیقت نگاری پر غالب رہتی ہے وہ سیاست کی چھڑی کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ جن لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں ان سے گہری واقفیت نہیں رکھتے وہ اشخاص سے زیادہ حالات پر نظر رکھتے ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں نمایاں ہوئے ہیروں کی چمک نہ ہونے کے باوجود زندگی کی رنگینی اس کی امیدیں اور مایوسیاں اور حسن اور بدصورتی ملتی ہے کرشن چندر ایک شاعر کا دل اور ایک مصور کا موئے قلم رکھتا ہے وہ فضا پیدا کرنے میں ماہر ہے سب سے پہلے اس نے ڈیڑھ فرلانگ لمبی سڑک کو زندگی عطا کی پھر حسن اور حیوان اور ٹوٹے ہوئے تاروں، نظارے، بے رنگ دیو، زندگی کے موڑ پر ان داتا، پشاور ایکسپریس، جب پھول سرخ ہیں) سمندر دور ہے شائع ہوئے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر ایک مستقل جگہ چھوڑ گئے کرشن چندر دراصل شاعر ہے جو اس بے رنگ و بو دنیا میں لا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کی بدصورتی اور حسن دونوں کو گلے لگایا اور بدصورتی میں بھی حسن دیکھا ہے۔ اس کے یہاں ایک ایسی قوت لطافت ہے جو زخموں پر مرہم رکھتی ہے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو امید کی کرن عطا کرتی ہے ان داتا بنگال کے قحط کی سچی تصویر نہیں خیالی مرقع ہے۔ مگر کرشن

چندر نے اس خیالی تصویر میں حقیقت کی تابناکی بھردی ہے پشاور ایکسپریس میں کرشن چندر نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی فسادات کا یکساں مجرم ٹھہرایا ہے۔ کچھ لوگ صرف کرشن چندر کا فارمولا دیکھتے ہیں وہ اس کی فراخی ہے تعصبی رواداری اور انسانیت پر توجہ نہیں کرتے حالانکہ اس افسانے سے جو کام لیا ہے وہ زندگی بڑا مقدس کام ہے اور کرشن چندر نے اسے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔

کرشن چندر کے بعد افسانے کی دنیا میں عصمت چغتائی کا نام لینا ضروری ہے عصمت کی بساط کرشن چندر سے محدود ہے ان کے افسانوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں پہلا مجموعہ کلیاں ہے لیکن چوٹیں" اور "ایک بات" ہمارے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں عصمت نے ہندوستان کے متوسط طبقے اور مسلمانوں کے شریف خاندانوں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو جس جرأت اور بے باکی سے بے نقاب کیا ہے ان میں کوئی ان کا شریک نہیں وہ ایک باغی کا ذہن ایک شوخ عورت کی ظرافت لسانی ایک فنکار کی بے لاگ اور بے رحم نظر رکھتی ہے وہ عورت ہیں مگر اس سے زیادہ ایک فنکار لیکن ان کا "لحاف" جو ادبی حلقوں میں بہت بدنام ہوا۔ اردو کے بڑے اچھے افسانوں میں سے ہے۔ انہیں جو عریاں کہے اسے زندگی کو عریاں کہنا چاہیے انہوں نے نوجوان لڑکیوں لڑکیوں، بوڑھی عورتوں اور بدشوہروں تبلیغی بیویوں کی بڑی کامیاب مصوری کی ہے۔ ان کے یہاں ڈرامائی کیفیت، قصہ پن، کردار نگاری مکالموں کی نفاست اور خوبصورتی نمایاں ہیں مگر انہوں نے جو گھریلو بامحاورہ چٹ پٹی اور رچی ہوئی زبان استعمال کی ہے اس کی جدید افسانوی دور میں کوئی اور نظیر نہیں، دوزخی کے نام سے انہوں نے اپنے کہانی

عظیم بیگ چغتائی پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بعض شرفا کو بے رحم اور بری معلوم ہوتا ہے مگر اردو میں اس
رنگ کی پہلی کامیاب کوشش ہے، عصمت کے اسلوب میں ایک ایسا زور اور جوش ہے جو پڑھنے
والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ان کی جگہ ہمارے افسانوی ادب میں محفوظ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی ان دونوں سے کم متنوع ہیں مگر ان سے کم اہمیت کے مستحق نہیں
ان کے دو مجموعے "رام دوار" اور "گرہن" اب تک شائع ہوئے ہیں انہوں نے
بہت کم افسانے لکھے ہیں۔ مگر جہاں تک افسانے کی تنظیم اور اس کے در و بست کا تعلق ہے
بیدی کرشن چندر اور عصمت دونوں سے آگے ہیں گرم کوٹ گھر میں بازار میں، گرہن
ہڈیاں اور پھول، زین العابدین رحمان کے جوتے ابو ہنس بڑے ستھرے افسانے
ہیں۔ بیدی نے افسانوں کو اپنے مشاہدے کی دنیا تک محدود رکھ کر اپنا نقصان نہیں
کیا پلاٹ اور کردار نگاری دونوں میں وہ منفرد ہیں ان کے قصوں میں تمہید
اور انجام کی نفاست دونوں کا لحاظ رکھا ہے، ان کی زبان میں غلطیاں ہیں مگر بیدی نہ
دہلی اور لکھنؤ کی زبان نہیں لکھتے وہ پنجاب کی اردو لکھتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں میں
تھوڑی سی دیر میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ خیال کیلئے
چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نزاکت نفاست دردمندی ایک خاموش حزن بیدی
کے خصوصیات ہیں اور ان کی ابدیت کی ضمانت۔

منٹو کی شخصیت زیادہ دلکش اور ان کے افسانے زیادہ مزیدار ہوتے
ہیں منٹو موپاساں اور راکم دونوں سے بہت متاثر ہوا ہے، ہتک کالی شلوار
بھائے نیا قانون، بابو گوپی ناتھ کھول دو، ان کے مشہور افسانوں میں سے
ہیں منٹو بڑا اچھا فنکار ہے، اس نے افسانے لکھنے سیکھے نہیں بلکہ وہ افسانہ نگار
پیدا ہوا تھا۔ وہ قصے کو مناسب موڑ دینے کا ماہر ہے اس کے یہاں کبھی بیجا
طوالت نہ ملے گی، وہ انسانی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے، وہ کردار نگاری

کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں ایک کردار پیش کر سکتا ہے مگر اس کا ذہن مریض ہے۔ اسے جنس اور اس کی بے راہ روی سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کے افسانوں میں زندگی ضرور ہے مگر ایک محدود اور مخصوص زندگی۔ اس کے یہاں جنسی یلذذ ملتا ہے۔ اسے فسادات پنجاب میں بھی ایسے واقعات خاص طور پر نظر آئے جہاں عورتوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک ہوا۔

اس کے یہاں ذہنی کجی ہے وہ مانٹو کی طرح کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا صرف اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانی فطرت بڑی عجیب و غریب ہے اور اس میں پستی بے راہ روی اور کجی زیادہ ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی بڑائی میں شبہ ہے۔

ان کے علاوہ اختر انصاری اختر اورنیوی علی عباس حسینی، اپندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی معین احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، بلونت سنگھ حیات اللہ انصاری غلام عباس ہمارے اچھے افسانہ نگاروں میں سے ہیں علی عباس حسینی ایک عرصہ سے لکھتے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں پختگی، حقیقت نگاری، فن کا التزام مکالموں کی موزونیت اور زندگی کی ایک کامیاب عکاسی ملتی ہے مگر ان کی اصلاح پسندی ابھی تک انہیں بڑا افسانہ نگار نہ بنا سکی۔ اختر اورنیوی نے کلیاں اور کانٹے اور منظر اور پس منظر میں اور اختر انصاری نے خونی میں ہماری بظاہر بے کیف مگر بھرپور دنیا کی بڑی اچھی تصویریں پیش کی ہیں۔ ممتاز مفتی اس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے افسانہ نگاری کو نفسیاتی شرح بنا دیا ہے۔ قاسمی نے پنجاب کے دیہات کی روح کو مقید کر لیا ہے۔

قرۃ العین ہماری جدید حجاب اسمٰعیل ہیں جنہیں ابھی اپنے نور و نغمہ کی دنیا سے نکلنا ہے اپندر ناتھ اشک دراصل جرنلسٹ ہیں خالق نہیں

بیگم اللہ کے افسانوں میں زندگی ملتی ہے، حیات اللہ انصاری کی آخری کوشش اُردو کے بہترین افسانے میں شمار کی جاسکتی ہے اور غلام عباس کا آفندی اپنے حسن تعبیر کی وجہ سے اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔

اُردو افسانہ اب حقیقت سے قریب ہو گیا ہے، اس نے فطرت انسانی کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا ہے اسے زندگی کی تبدیلیوں کا بھی پورا احساس ہے اگر وہ خطابت اور انشاء پردازی کے چکر سے دور نکل جائے تو اس میں اور بلندی آجائے۔



اُردو شاعری میں خمریات

شعر و ادب میں شراب کا ذکر اس کثرت سے کیوں رہتا ہے یہ تو اس پرانے گنہگار سے پوچھیے جو مست جام شراب ہونا کافی نہیں سمجھتا بلکہ غرق جام شراب ہونا چاہتا ہے۔ میں تو توبۃ النصوح قسم کا آدمی ہوں دور سے تماشا دیکھنے والا میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے رندکس شراب سے مست تھے ان کی شراب نئی ہے یا پرانی، شراب طہور ہے یا شراب پرتگالی، ان کی مستی بادہ و ساغر والی مستی ہے یا وہ صرف کیفیت چشم دیکھ کر مست ہو گئے ہیں تا دو بے پیے ہی جھومنے جاتے ہیں یا نظر کو چند موجوں پر جا کر بے خبر ہو گئے ہیں۔

اُردو شاعری کا ابھی بچپن تھا کہ اس پر فارسی کا اثر شروع ہوا۔ فارسی غزل کی جان ہے، عشق و محبت کی داستانیں اور رندی و سرمستی کے مرقعے ہیں۔ یہ رندی و سرمستی اُردو میں کیسے نہ آتی۔ آئی اور خوب آئی پہلے پہل لوگ پیتے بھی اور تھے اور ان کی مستی اور قسم کی ہوتی تھی، آگے چل کر ان کی شراب اور ان کی مستی اس دنیا کی چیزیں ہو گئیں۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا۔ جب بے پیے مست ہوتے تھے اور اچھے اچھے پرہیزگار شراب کے مضامین اس وجہ سے باندھتے تھے کہ ان کے بغیر غزل مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ خمریات کے عناصر میں شراب ساقی پیر مغاں جام و ساغر، مستی و سرشاری، باغ و بہار سب آتے تھے، میخانہ کا مقابلہ

جام دے مزدور تھا اور واعظ محتسب یا زاہد یا شیخ کی پگڑی اچھالنی بھی لازمی تھی یہی سب مضامین فارسی میں صدیوں تک باندھے گئے، اُردو میں بھی ان کی تقلید ہوئی، جس طرح فارسی کے آغاز میں تصوف کا رنگ بہت گہرا ہے، اسی طرح اُردو کی ابتدائی شاعری بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری اور درویشی مترادف الفاظ تھے صوفیوں کی طریقت کا یہ راستہ شریعت سے الگ تھا، شریعت ظاہری حالت پر زور دیتی تھی، طریقت میں باطنی کیفیت سب کچھ ہوتی تھی، عالم باطنی کے مدارج طے کرنے اور معرفت الہی حاصل کرنے کے لیے عشق مجازی کے زینہ سے بھی گذرنا پڑتا تھا لیکن اس عالم میں اصطلاحات کے معنی کچھ اور تھے، یہاں شراب سے عرفان ساقی سے ذوالجلال اور پیرمغاں سے پیر طریقت مراد تھے اور شیخ یا زاہد کی تضحیک اس وجہ سے کی جاتی تھی کہ وہ ظاہری حالت کو دیکھتا ہے باطن پر نظر نہیں کرتا جب تک تصوف کا دور دورہ رہا اس قسم کے مضامین میں کوئی ایسی چیز نہ ہوتی تھی جس کا اطلاق حقیقی رنگ پر نہ ہو سکے تصوف کے مضامین کو اس طرح بیان کرنا کہ غزل کی لطافت قائم رہے اور معرفت الہی کے مضامین، عشق مجازی سے بے میل نہ ہو جائیں یہی قدرکار کا کمال تھا اُردو میں ولی سے درد تک کا کلام دیکھئے شراب کے مضامین ان بزرگوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں بلکہ ولی اورنگ آبادی کے دیوان کی بعض ردیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مادی حسن وعشق سے بھی ناآشنا نہ تھا مگر بحیثیت مجموعی ان کے مضامین میں وہی شراب معرفت مراد ہے یہ مضامین تغزل کے دائرے میں بیان ہوتے ہیں۔

آلودہ کیوں ہوئے داماں پاک زاہد ولی جب دست نادمیں میں نام شراب ہوتے

شب روز اسطرح گذرے ہیں اپنی تو نہ پوچھو کچھ — دند صراحی بیچ کو گر ہاتھ ہے تو شام آئے شیشہ

نگاہ مست ان آنکھوں کی تنک ادھر بھی ہو ساقی — کہ ہم کم حوصلوں کے حق میں ہر اک جام ہے شیشہ

آتش مے سے جو زاہد نے اسے بھڑکایا — زاہد خشک ہوا خوب ہی تر پانی میں

اسی زمانے میں ظاہری حالت پر طعن کرنے والوں کو شاعر کی طرف سے یہ زبردست جواب دیا گیا تھا۔ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد اور میر کا زمانہ ایک ہی ہے۔ لیکن میر کے یہاں جو اشارے ملتے ہیں۔ ان میں تصوف کی چاشنی سے زیادہ عشق مجازی کی گرمی ملتی ہے میر کے والد ایک درویش صفت آدمی تھے۔ مرتے وقت بیٹے کو نصیحت کر گئے تھے کہ عشق اختیار کرو۔ اس کے ساتھ دل نہایت دردمندانہ اور گداز پایا تھا چنانچہ میر کی شاعری میں عشق و محبت کی سچی اور بے لاگ تصویریں ملتی ہیں انکا عام نقطۂ نظر صوفیانہ ہے لیکن ایک غزل انکے یہاں ایسی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ یہاں کی چیز بھی ملی ہوئی تھی پوری غزل مرصع ہے اور خمریات کا بہترین نمونہ ہے جو اشخاص میر کو صرف مصور غم کا درجہ دیتے ہیں وہ دیکھیں کہ اس غزل میں کتنے جوش سے فلسفۂ عیش و مسرت کی تلقین کی گئی ہے۔

شیخ جی آؤ مصلے گرو جام کرو — جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے و جام کرو

فرش مستاں کرو سجادہ بے تہ کے تئیں — مے کی تعظیم کرو شیشہ کا اکرام کرو

دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے — آپ کو مغبچوں کے قابل دشنام کرو

نیک نامی و نفادت کو دعا جلد کہو — دین و دل پیش کش سادہ خود کام کرو

ننگ و ناموس سے در گذرو جوانو ملکر — پر فشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو

اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب — خدمت بادہ گساراں بھی سرانجام کرو

خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
خدمت بادہ گسا دل گرمی ایام کرد
سایہ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو، آپ کو بدنام کرد
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرد

میر کے علاوہ ان کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی شراب کے مضامین برابر ملتے ہیں۔ انشا جیسا درباری شاعر بھی برف لگا کر صراحی مے طلب کرتا ہے ناسخ کے زمانے میں خمریات میں ابتدال آچلا تھا یہ لوگ نہ تو بادہ تصوف کے ذوق چشیدہ تھے نہ رند شاہد باز۔ ان کے یہاں شراب کے مضامین اس لیے باندھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے باندھے جاتے تھے خصوصاً صحبت کا ذکر تو تمام تر رسمی ہے آتش کے یہاں تصوف اور عشق دونوں کی گرمی ہے اس لئے ان کی مینا میں بھی رنگ باقی ہے انکے زمانہ میں خمریات غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں جس طرح عربی میں ابو نواس اور فارسی میں خیام کی خمریات مشہور ہیں اسی طرح اردو میں غالب کی۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے ۔ مشاہدہ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ غالب کے یہاں شراب کے مضامین تصوف والی شراب کے بارہمی طور پر ہیں۔ انکی شراب صاف صاف شراب پرتگالی ہوا ہیں بہشت اگر عزیز ہے تو اس شراب کی وجہ سے ان سے جب کوئی کہتا کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ جسے شراب میسر ہو اسے اور کیا چاہیے؟ ان کے محبوب کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ وہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے ہے۔ ان کی محفل کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر ہے ان کے ہوا میں شراب کی تاثیر ہے، وہ اپنی مستی آڑ میں محبوب سے بے تکلف بھی ہو جاتے ہیں بہشت و دوزخ کا استہزا بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ بہت سی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ غالب کے

بیشتر اشعار عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہیں۔ چند پر اکتفا کی جاتی ہے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ ارباب چمن! — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

وہ شے کہ جس کیلئے ہو ہمیں بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

پر پروانہ شاید بادبان کشتیٔ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا — سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اور دیکھئے توبہ کر لی ہے، ساغر و مینا توڑ چکے ہیں لیکن پھر بھی کس مزے سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ے

توڑ کر بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

واعظ کے متعلق یہ بلیغ شعر بہت سی پھبتیوں سے اچھا ہے۔ اس میں نہ تو ذوق کی طرح اس کی داڑھی کو شراب سے رنگا ہے، نہ ناسخ کی طرح اس کی داڑھی کا بال نذر کر لیا ہے بلکہ اس کے ظاہر و باطن پر عجیب لطف سے تبصرہ کیا ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کی خمریات میں ان کی رفعت تخیل اور لطافت بیان کے ساتھ ان کا
شوق مے کشی بھی شریک ہے۔ اسی شوق مے کشی کی وجہ سے ان کے اشعار میں شراب
کی تمام مستی موجود ہے اور کہیں کہیں تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ ؎

آئینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس تندیٔ صہبا کے تمام مدارج پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسی ہی کوشش
ہو گی جیسے غالب کے رشک کے مضامین کو سلسلہ وار بیان کرنے کی آپ نے دیکھا
کہ خمریات کا رنگ غالب کے یہاں سب سے نمایاں ہے۔ یہ نہ رسمی ہے نہ صوفیانہ
بلکہ یہ ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے بعد داغ نے خمریات کے تمام
مدارج کو اپنی غزلوں میں برتا ہے، داغ کا حال بھی غالب کا سا ہے دونوں ہم مشرب
ہیں۔ داغ کی شوخی و بے باکی رندانہ مضامین میں خوب نمایاں ہوتی ہے اور
اگر انہیں کوئی محاورہ نظم کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو شعر اور بھی چمک جاتا
ہے ان کے یہاں طنز اور چھیڑ چھاڑ بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ طنز یا تو معشوق پر
صرف ہوتی ہے یا پیر زاہد پر مثلاً ؎

زاہد کو ایک قطرۂ زمزم پہ ناز ہے
یاں خم کا خم اڑا گئے پیر مغاں کے ساتھ

دیکھنا پیر مغاں حضرت واعظ تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو

کی ترک مے تو مائل ہو گیا
میں توبہ کر کے اور گنہگار ہو گیا

مے انگور فرشتوں کی بھی قسمت میں نہیں
اس سے محروم ہیں اک قبلۂ حاجات بھی کیا

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور　　کیا چیز حرام ہو گئی ہے

جا کے پی آئے وہاں آتے ہی توبہ کر لی　　اس قدر دور ہے مسجد سے خرابات کبھی کیا

یہ رنگ جو داغ کے یہاں حقیقی ہے امیر کے یہاں رسمی اور داغ کی سی ہے اس لیے اچھے شعر کم ہیں تاہم ایک شعر میں ضرور یہ مضمون ملا جس کے متعلق یہ یقین نہیں آتا کہ امیر کا ہے۔

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں　　جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

مگر ان کے ایک شاگرد ریاض خیرآبادی نے جو مینائے امیر کی مستی پر مر کر مست تھے خمریات میں خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ریاض کی طبیعت میں غیر معمولی شوخی تھی وہ ساری عمر جوان رہے اور ساری عمر عاشق۔ حسن کی شوخی کا تو سب نے ذکر کیا ہے۔ مگر ریاض کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں انہی بلبلی مسکراہٹ ایک ایسی شوخی ہے جس کا جواب حسن کے پاس بھی نہیں انہوں نے ساری عمر شراب کے مضامین لکھے۔ شراب کے لیے بڑے ہی پیارے پیارے نام وضع کیے بھلا امیر جیسے پرہیزگار کے شاگرد کا دامن اس معصیت سے کیسے آلودہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ جس شاعر کے دیوان میں بقول مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپوری تیرہ سو چھیاسٹھ اشعار خمریات کے ہوں وہ شراب سے نہ بچ سکا ہو۔ بہر حال یہ حقیقت ہے اور حقیقت اکثر تلخ ہوتی ہے۔ چنانچہ ریاض کے حسب ذیل بے مثل اشعار دراصل رنگین ہیں۔ یہاں شراب سے وہ کیفیت مراد ہے جو عشق میں حاصل ہوتی ہے یا جوانی کے راستہ سے آتی ہے۔

چھلکائیں بلاؤ بھرے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمہ زمزم نکلتا ہے

فرشتے عرصہ گاہ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج لطف لغزش مستانہ آتا ہے

مرے گھر پر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے
میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

جام سے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

سایہ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشہ میں اسے ہم نے اتارا کیا

اٹھے کبھی گھبرا کے تو مے خانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

توبہ سے بڑھا یا ہے ساقی نے یہ کہا
توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا

ان اشعار سے حقیقت میں اس عام طبقہ کی تسکین ہو جاتی تھی جو شراب اس لئے نہیں چکھ سکتا تھا کہ مذہب نے اسے ممنوع قرار دیدیا تھا، یہ علامات جن کے ذریعہ سے قدما کے دور میں ایک خاص کیفیت کا اظہار ہوتا تھا اب ادب و شاعری کا جزو اعظم بن گئی تھیں اور اچھے اچھے پرہیز گار اس کوچہ میں ساغر و مینا اچھالتے نظر آتے تھے۔ شاد عظیم آبادی کو دیکھئے، انہیں اس دور کا میر کہا جاتا ہے ان کے یہاں اضطراب کا عالم کس طرح بیان ہوتا ہے ؎

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا

اور ان کا یہ شعر دیکھئے کیا یہ صرف میخانہ تک ہی محدود ہے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مگر اس دور میں جگر کی شاعری خمریات کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے جگر ایک رند مشرب۔ رند وضع شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جو شراب ہے اسے بادہ تصوف سے کوئی علاقہ بقول ایک نقاد کے اتنی دلچسپی باقی ہے جیسی جتنی صہبا سے ہے وہ شراب کے لئے اور شراب ان کے لئے بنی ہے جس جوش وغیرہ وغیرہ سے وہ اپنی ہستی یا بادہ و ساغر کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کی اپنی زندگی سے لیا گیا ہے ان کی شاعری ان کی زندگی ہے اور ان زندگی ان کی شاعری دیکھئے۔

مستو جام شراب خاک ہوئے ؟
غرق جام شراب ہونا تھا !

شیشہ مست و بادہ مست عشق حسن مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

ہم کہیں آتے ہیں واعظ ترے بہکانے میں
اسی مے خانے کی مٹی اسی مے خانے میں

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے میخانے میں

مے کشو مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں
آج اک موج بہا لے گئی میخانے کو

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

سرمستی ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

زاہد یہ میری شوخی انداز دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

غزل کے علاوہ نظموں میں بھی خمریات کا عنصر کافی ہے۔ مثنویوں میں شاعر جب سلسلۂ کلام شروع کرتا ہے تو پہلے ساقی سے دو چار جام طلب کر لیتا ہے تاکہ تیزیٔ سخن اور زیادہ ہو۔ یہ وہی چیز ہے جو انگریزی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ وہاں شاعری کی دیوی سے خطاب ہوتا ہے یہاں ساقی سے چنانچہ ملٹن کی مشہور "فردوس گم شدہ" کے ہر باب میں یہ سلسلہ اسی طرح شروع ہوتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ ساقی نامے اس قدر مقبول ہوئے کہ مرثیے جیسے مخصوص اور محدود عنوان کے تحت بہار اور ساقی نامہ کا عمل دخل ہو گیا۔ انیس نے بہار کا ذکر کیا تو ان کے نواسے پیارے صاحب رشید نے ساقی نامہ اضافہ کر دیا۔ ان مضامین کے ذریعے سے صرف قدرت

دکھانا مقصود تھا۔ نظیر اکبر آبادی کے یہاں بھی شراب کے مضامین ملتے ہیں مگر بالکل اسی طرح جس طرح عشق و جوانی کے مضامین نظیر زندگی اور اس کی نعمتوں اور لذتوں کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جہاں شراب کے مضامین ہیں ان میں علامتی رنگ غالب ہے آج کل ساغر اور جوش کے یہاں خمریات کا عنصر بہت کافی ہے ان خمریات سے ملتی جلتی ہیں، جوش کے چند پیرے پڑھیے یا پڑھیے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جیرڑھتے ہوئے کے تجزیہ کی کیسی کامیاب کوشش ہے، ساغر جب پکارتے ہیں کہ ؎

بھر بھر کے پیالوں میں جوانی دیدے

تو وہ بھی شراب مانگتے ہیں، ان دونوں شعراء کے یہاں شراب ہی شراب ہے اس میں علامتی رنگ بالکل نہیں، یہ مستی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ان کا فلسفہ زندگی لذتیت سے تعبیر ہوا ہے۔

اس مستی کو نیا کہئے یا پرانا اس میں اور قدماء کی مستی میں یقیناً فرق ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور قسم کی تبدیلی بھی صاف صاف دکھائی دیتی ہے واعظ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ جو خمریات کا محبوب مضمون تھا، اب تک مستقل چیز ہوگئی ہے، اس کی وجہ سے یہ ہے کہ اس دور میں قدامت کے بچاریوں کا سب سے بڑا اسہارا اور جدیت کی طاقتوں کو سب سے زیادہ سختی سے رد کرنے والا یہی زاہد یا واعظ ہے۔ ہماری رندانہ شاعری میں اس کی ڈاڑھی پر پھبتی اڑائی جاتی تھی۔ اس کی ریاکاری کا پول کھولا جاتا تھا، اس کے ظاہر و باطن کا فرق دکھایا جاتا تھا، اب اکبر، جوش اور اقبال نے ان کی ذہنیت پر سے نقاب اٹھایا ہے۔ چنانچہ اقبال کے یہاں صوفی یا ملا یا زاہد یا سالوس کے خلاف بہت کچھ ملتا ہے اکبر ملا پر اس لئے چوٹ کرتے ہیں کہ وہ بہت

بڑے طنز نگار ہیں اور جہاں کہیں انہیں فساد نظر آتا ہے وہ بغیر نشتر استعمال
کئے نہیں رہ سکتے۔ جوش کے طنز میں قدیم اور جدید رنگ کا اتصال ملتا ہے
واعظ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ شرابی کیوں نہیں۔ اقبال اس سے اس لیے
ناراض ہیں کہ وہ صحیح معنی میں مسلمان نہیں ہے، اور ملت بیضائی رہنمائی
کے قابل نہیں رہا اس کے علاوہ چکبست نے کہیں کہیں بادہ ساغر کے
پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی اور نوحہ قومی "چھیڑا ہے اپنے زمانے
کی نیم خود مختار حکومت کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔ ؎

ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے — ایک ساغر عنایت نہ ہوا یاد رہے
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے — یہ کیسی بزم ہے اور کیسے ساقی ہیں

آزادی کا یہ تصور پیش کرتے ہیں ؎

نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گلا ہوتا — مے گلرنگ لٹتی یوں در میخانہ وا ہوتا

اقبال نے سب سے پہلے خمریات کے پیمانے کو چھوڑ کر ایک نیا ساز چھیڑا
ہے بانگ درا میں وہ ساقی سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی — نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی — جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی — کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری

لیکن اس سے زیادہ اہم ان کا وہ ساقی نامہ ہے جو بال جبریل میں شامل
ہے اور جس میں انہوں نے دور حاضر کے اہم مسائل پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ ساقی
نامہ اقبال کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے یہاں شاعر
ساقی سے جو شراب مانگتا ہے، وہ زندگی، حرکت عمل خودی کی بلندی کا اور
انسانوں کی معراج سے عبارت ہے، اس کی ایک ایک شعر میں بڑھتے

بڑا مضمون آگیا بہار کی آمد ایک شعر میں بیان ہوتی ہے ؎

جہاں چھپ گیا پردہ رنگ میں   لہو کی گردش رگِ سنگ میں

اقبال کیا مانگتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات   وہ مے جس سے ہے مستئ کائنات
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے   لڑا دے ممولے کو شہباز سے

دورِ حاضرہ پر ملاحظہ ہو ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے   نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے   زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا   تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے   ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش   مگر دل ابھی زنار پوش
تمدن تصوف شریعت کلام   بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی

وہ چاہتا کیا ہے، یہ بھی سن لیجئے ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے
امنگیں مری آرزوئیں مری   امیدیں مری جستجوئیں مری
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

موجودہ سیاسی انقلاب تہذیبوں کے نکھرنے کے بعد کی زندگی نے بادہ و ساغر کو ایک نیا کیف دیا ہے اور ہمارے تمام اچھے شاعروں نے مے کدے کی ویرانی، ساقی کی بے پروائی اور رندوں کی لغزش کے پردے

میں زندگی کے حقائق بیان کیے۔ اس طرح زندگی کو بہلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور اسے سدھارنے کی بھی۔

جوش نے حال میں "ساقی سے خطاب" موجودہ تنگ نظری پر بڑی خوبی سے طنز کی ہے، غزل گو شعراء بھی اس رنگ میں پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے ساقی و میخانے کے رمز و ایما میں جدید ہندوستان کے سنہرے خواب اور تلخ حقائق دونوں کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ہر پیمانے میں ماہ تمام کی تجلی آگئی۔

خطوط میں شخصیت

اقبال کا یہ شعر تو آپ نے سنا ہو گا۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود ؟

اقبال کے نزدیک آرٹ میں بڑی اہمیت ہے مگر خلوص و ریاض سے آپ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، انہیں دیر تک اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے اس کے لئے شخصیت کی ضرورت ہے۔ ہڈسن کا خیال یہ ہے کہ شخصی اور انفرادی تجربہ ہی ادب کی جان ہے حسن شاعری، سچائی کی طرح شخصیت سے دو چار ہوتے تو فوراً پہچان لیتے ہیں ادب میں تازگی، ندرت، سچائی اور زندگی شخصیت سے آتی ہے شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ منہ سے بولنے لگتے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں نالہ مے میں سرور اور شیشے و صراحی میں شمشیر کی تیزی ملنے لگتی ہے، ادب میں شخصیت کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادب کی ہر شاخ میں اس کا ظہور ہوتا ہے مگر جس طرح سفید رنگ نکیلے شیشے میں گذر کر کئی رنگوں میں بٹ جاتا ہے اور اسلئے بعض اوقات اسکا پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔ ناول اور ڈراما میں شخصیت کا

اظہار اور طرح ہوتا ہے، شاعر میں اور طرح اول تو شخصیت خود ایک رنگ ایک مزاج یا ایک کیفیت کی حاصل کم ہوتی ہے، اس میں خدا جانے کیا کیا نشیب و فراز ہوتے ہیں، دوسرے اظہار کی دشوار گذار وادیوں سے گذرتے گذارتے اس میدان میں بہنے والے دریا کی طرح نہ معلوم کیا کیا مل جاتا ہے، شعور اور لاشعور کی کیسی کیسی بھول بھلیاں تاریخ تہذیب اور تمدن کی کتنی بھولی بسری یادیں ملک اچھا اور زمانے کے کتنے نقوش کتنی سنہری خوابیں اور کتنی تلخ حقیقتیں اس لئے ایک اچھا نقاد کسی ایک معیار یا پیمانے پر قناعت نہیں کرتا وہ کئی چیزوں کو دیکھتا ہے کتنے نقاب اسے اٹھانے پڑتے ہیں تب جاکر حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے بعض اشخاص تو آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں پہلی ہی نظر میں ان کی افتاد طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے وہ ایک ہی کتاب اپنی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں لیکن بعض ایسے چکنے ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آتے آتے پھسل جاتے ہیں اس لئے ہمیں ان کے ذاتی حالات روزمرہ کی زندگی کے واقعات، بے تکلف لمحوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔

خطوں میں ان سب باتوں کی مصوری ہو جاتی ہے، اس لئے یہ سچ ہے کہ افتاد مزاج کو سمجھنے کے لئے خطوط کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہے مولوی عبدالحق نے ایک جگہ کہا ہے کہ "خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے اس میں وہ صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔

خطوں سے انسانوں کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ یہ خیالات بڑی حد تک صحیح ہیں کہ یہ بات

نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جب خط اشاعت کے لیے یا اشاعت کو ذہن میں رکھ کر لکھے جاتے ہیں تو وہ خلوص اور بے ریائی جو ان کی جان ہے بعض اوقات ہضم پڑ جاتی ہے خط کیا ہیں ؟ بقول غالب کے جو بات پاس کے لوگوں سے کی جاتی ہے اسے دور لوگوں تک پہنچانا گفتگو کو تحریر کا مکالمے کو مراسلے کا جامہ پہنانا اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش انشاپردازی کی شان تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہیں یہ انشائے لطیف کا چمن ہیں! ان میں لکھنے والے کے تاثرات جا بجا جلوہ گر ہیں مگر یہ خط نہیں، خطوط کے اسلوب اور فارم سے ان میں فائدہ اٹھایا گیا ہے، اسی طرح غدر سے پہلے خط لکھنے جو دستور تھا وہ رسمی، پُر تکلف اور نمائش تھا جیسے دیکھو بچھا جاتا ہے، بات کم کرتا ہے، سات تسلیمیں زیادہ، جذبات کی اس قدر نمائش ہے کہ خلوص غائب، سب خط ایک سے ہیں سب میں ایک طرح کی عقیدت یا شفقت کا اظہار ہے، صرف تھوڑا سا اظہار یا فرق ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی مزاج کا خاصہ تھا جو انفرادیت کو گوارا نہ کر سکتا تھا جو سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا تھا اور الفاظ کے زور سے اپنا لوہا منوانا چاہتا تھا۔

ان خطوط سے کسی کی انفرادیت کا پتہ لگانا ایسا ہی ہے، جیسا سمندر سے امرت نکالنے کی کوشش جو دیوتا کر سکتے ہیں، انسانوں کے بس کی بات نہیں۔

غالب پہلے شخص ہیں جو اپنی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں اور اس شخص کا کمال یہ ہے کہ عظمت و رفعت کے بجائے وہ انسانیت پر اعتماد کرتی ہے، ایک

بت بن کر اپنی پرستش کرانے کے بجائے وہ انسان بن کر دلوں میں رہتی ہے غالب کے خطوں ہی میں خطوں میں کی بیشتر خصوصیات مل جاتی ہیں، یہ فطری اور بے تکلف ہیں ان میں نمائش اور ظاہر داری مقصود نہیں، اشاعت کا خیال بھی غالب کو اپنی ذاتی خواہشات کے اظہار سے نہیں روکتا پنشن کی تلاش بدستور ہے پینے پلانے کا تذکرہ جاری ہے۔

نواب یوسف علی خاں انور نواب کلب علی خاں سے عرض مدعا کرتے ہیں۔ کبھی آشیاں چیدن اور آشیاں بستن کے مسئلہ پر صاف صاف گفتگو کرتے نہیں شرماتے کبھی یوسف مرزا سے تعزیت کرتے ہیں کبھی میاں داد خاں سیاح کو چلتے چلاتے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے نام سے ایک صاحب کے اعتراض کا جواب چھپوایا ہے۔

غالب کے خطوط سے جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ ہر حال میں اور ہر رنگ میں اپنی مثال آپ ہے وہ اپنے کلام پر نازاں اور اپنی قسمت پر ماتم کناں ہے وہ دنیا کے اچھے خاصے شعور کے باوجود محض دنیادار اور زمانہ ساز نہیں ہیں وہ ایک خاص ادبی مذاق کی علامت ہے۔ مگر محض ادبیت کو اوڑھنا بچھونا نہیں بناتی غالب کی شاعری سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ خالق نے انہیں حیوان ظریف کیوں ہے ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طبیعت میں ظرافت غالب تھی۔

غالب کے کلام سے غالب کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اس غالب کی ہے جو خیال کی دنیا میں رہتا تھا۔ خطوط میں وہ غالب ملتا ہے جس کے قدم زمین پر جمے ہیں جسمیں زندگی بسر کرنے کا حوصلہ اور برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنے کا ولولہ ملتا ہے جو اپنے نام سے فائدہ اٹھاتا ہے اگر اپنے فن کو ذلیل نہیں کرتا۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ دونوں تصویروں میں اختلاف کے باوجود زندگی انفرادیت اور ایک ابدی تازگی ہے، غالب آسمان پر ہو یا زمین پر وہ ہر جگہ منفرد ہے وہ عیین انداز سے مانگتا ہے۔ دوسرے اس انداز سے دے بھی نہیں سکتے۔ غالب اور ناظم کے پڑھیے تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا۔

غالب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، کچھ ان کی شاعری میں جھلکتے ہیں اور کچھ نثر اور خطوط میں ایک کے بغیر دوسرے کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ غالب کی رنگا رنگ شخصیت کا اثر ہے، مگر سرسید اور حالی کے خط ایک وحدت رکھتے ہیں۔ سرسید کے یہاں ایک ہی رنگ، ایک ہی سر، ایک ہی جذبہ ملتا ہے ان کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز ان کی دردمندی اور خلوص ہے اس وجہ سے ان کے مضامین ایک تاثیر اور خطوط میں رفعت ملتی ہے خطوں میں وہ یہ شخصیت جھلکتی ہے جو تہذیب الاخلاق کے کالموں میں ہم ایک لیڈر۔ ایک مصلح قوم ایک معلم اخلاق ایک سیاسی رہنما ہے ہر جگہ دوچار ہوتے ہیں، سرسید کے خط غالب کے خطوں کی طرح دلچسپ نہیں ہیں۔ سرسید کے یہاں نہ کوئی راز ہے جس کا پردہ اٹھنے میں دلچسپی ہو نہ نشیب و فراز ہیں جن سے گذر کر انسان ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا نظارہ کرے، وہ انگلستان میں بھی وہاں کی حوروں کو دیکھ کر صرف یہ کہتے ہیں کہ جنت کا ہونا سچ ہے مگر ان کی قسمت میں وہی قوم کا رونا ہے، سرسید کی دراصل کوئی بھی پرائیویٹ لائف تھی ہی نہیں۔ ان کے یہاں یہی قوم خدمت کا جذبہ ہے جو ہر رنگ میں اور ہر جگہ نظر آتا ہے حالی بھی سرسید کی طرح ہیں ان کے خط بھی دلچسپ نہیں کہے جا سکتے، وہ نہ کبھی جوش میں آتے ہیں نہ کسی کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں نہ کسی کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک یکساں، دھیما، سنجیدہ، متین شریفانہ، مہذب اور روشن

مزاج ملتا ہے جو خطوں کو اپنی طرف کر لیتا ہے گر وہ زیادہ دیر تک انہیں ساتھ نہیں رکھ سکتا ان کے دلوں سے انسانی سیرت کی نیرنگی اور بوقلمونی پر روشنی نہیں پڑتی ، اس کی عظمت کا نقش ضرور ہوتا ہے ۔

ہاں شبلی اور اکبر کے خطوط ضرور ایسے ہیں جو اگر منظر عام پر نہ آئے ہوتے تو ہمیں ان دونوں کی فطرت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا ۔ شبلی کے خط حالی کے خطوں سے زیادہ دلچسپ ہیں ۔ شبلی ایک تو عالم اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ان کے خط ان کی علمی زندگی کے آئینے ہیں دوسرے پرائیویٹ زندگی میں ان دو تعلیم یافتہ خواتین کا جو اثر ہوا ہے وہ بھی ان خطوں سے ظاہر ہوتا ہے بعض حلقوں میں ان خطوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے حالانکہ شبلی کی غزلیں دیکھی جائیں تو خطوں کی طرح انس و تعلق خاطر کا اظہار ہے اس کا راز سمجھ میں آجائے گا شبلی بڑے جذباتی آدمی تھے ۔ وہ شاعر و نکتہ سنج تھے وہ خاصے جدت پسند تھے اور اپنے حلقے سے بہت آگے تھے وہ ڈاکٹر انصاری کے قدموں کا بوسہ لینے کے لئے تیار تھے محض اس لئے کہ وہ ترکوں کی خدمت کے لئے جا رہے تھے پھر اگر انہوں نے بعض تعلیم یافتہ خواتین کی ہمت افزائی کی تو اس سے خواہ مخواہ غلط نتیجے نہ نکالنے چاہئیں ۔

مکاتیب شبلی میں شبلی صرف عالم دین اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔ خطوط شبلی میں ان کے اصلی خیالات ملتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ اپنی پبلک زندگی کی مجبوریوں اور مصلحتوں کی وجہ سے اپنے اصلی خیالات ظاہر نہیں کر سکتے تھے اس سے شبلی کو منافق سمجھنے کے بجائے زندگی اور اس کی دشواریوں کا اندازہ کرنا چاہئے ۔

شبلی کے خطوط سے میری نظر میں ان کی عزت بہت زیادہ ہو گئی ، اور اکبر کچھ کر گئے ۔ حیرت ہے کہ اکبر جیسا شاعر جو اشعار میں ایسی شوخ اور چنچل شخصیت رکھتا ہے خطوں میں کیوں اس قدر کمزور مصلحت بیں ، چند رس اور چڑ چڑا نظر آتا ہے یہ نہیں کہ یہ خط اکبر کے نہ ہوں ان میں جا بجا جو جھلکیاں ہیں آلام و افکار کے بادلوں میں جو شعر و فن کی بجلیاں ہیں وہ اکبر کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتیں مگر ملازمت نے اکبر کو اتنا ڈرپوک بنا دیا تھا کہ وہ ادھر وار کرتے تھے ادھر معافی مانگتے ۔ تھے وار کرنا فطرت کی طرف سے تھا اور معافی مانگنا انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا ۔ یہ نہیں کہ اکبر باغ و بہار آدمی نہ ہوں ۔ وہ تو ہر وقت ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنا ہنسانا ان کی عادت ہو گئی تھی ، یہ ایک اوپری قالب تھا جس کے اندر ایک سوکھی ساکھی طبیعت چھپی ہوئی تھی ۔ کچھ یہ بھی ہے کہ اکبر کے جو خط چھپے ہیں وہ ان کے بڑھاپے کے ہیں ، یہ جوانی کے نشے کا خمار ہے ۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کل کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں بعض ہوٹل کے بیروں کا تبسم ایک میکانکی انداز رکھتا ہے کیا انہیں انعام دیجیے وہ مسکرا کر آپ کا شکریہ ادا کریں گے ، ان کا تبسم آپ کے انعام کی قیمت ہے جو انعام کی تعداد پر منحصر ہے ۔

اسی طرح بعض ادبی شخصیتیں ہیں خطوں میں ان کے مذاق خاص کی خوب غمازی ہوتی ہے ۔ مہدی افادی اور نیاز فتحپوری اس ذیل میں آتے ہیں نیاز کا شعر پڑھتا اور ۔ مہدی کا عورت کا حوالہ قریب قریب برابر ہیں عورت اور شعر دونوں بڑی دلچسپ چیزیں ہیں ، جو ان پر ایمان نہ لایا ، لیکن زیادتی ہر چیز کو بری کہتی ہے ۔ نیاز کے خطوں میں ایک دلکش ادبیت ہے ، ان میں طنز بھی ہے اور

ظرافت بھی، چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور نشتر بھی، وہ ایک ادبی شعور کے آئینہ دار ہیں جو بقول مہدی افادی دوم درجہ کا ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ان خطوں میں کہیں ان کا اسلوب نہیں بدلتا کہیں وہ شعر پڑھنا ترک نہیں کرتے، کہیں خاص خاص تلمیحوں سے کام لینا نہیں چھوڑتے یہ چیز ان کا مزاج بن گئی ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں اس میں کوئی ارتقا نہیں معلوم ہوتا اس میں ہلکے اور گہرے رنگ نہیں ملتے ان میں زندگی سے زیادہ کتاب ہے بقول آنر حنیف کے یہ وہ ادب ہے جس سے کسی اور ادب کی بو آتی ہے، نیاز کے خطوں میں خط سے زیادہ مضمون کا اسلوب ہے، نیاز افسانوں بھی دراصل انشاء پرداز تھے اور خطوں میں بھی وہ انشاپردازی ہی کے جوہر دکھاتے ہیں، یہ ان کا مزاج سہی مگر ان سے خطوں کی نوعیت دوسری ہو جاتی ہے۔

مہدی کے خط بھی بڑے دلچسپ ہیں خصوصاً ان کی رنگین اور جمالیاتی شخصیت کی وجہ سے، مگر نیاز کی طرح سے یہاں بھی ایک تکلف ہے، یہ تکلف ان کی فطرت بن گیا ہے، ایک فرانسیسی ادیب کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اس کے کردار آپس میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ ایک فقرہ دوسرے فقرے سے باتیں کرتا ہے۔ یہی بات نیاز اور مہدی افادی کے یہاں ہے، ان کی ادبیت انہیں خطوں سے نکال کر مضمون کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ وہ خط ہیں جو اشاعت کے خیال سے لکھے گئے ہیں، یا رسالوں میں شائع کئے گئے ہیں۔ انہیں پڑھ کر وہ وہ تصویریں یاد آتی ہیں جن میں مصنف کے چہرے پر ایک خاص رنگ اور اس کے ہاتھوں میں ایک خاص کتاب ضرور دکھائی جاتی ہے میں ان خطوں کی بعض دوسری خوبیوں کا بڑا قائل ہوں اور انہیں اب بھی لطف سے پڑھتا ہوں مگر ان میں خطوں کا اصلی جوہر نسبتاً کم ہے۔

اس کے مقابلے میں محمد علی کے خط ہیں جن میں خطوں کی ساری خوبیاں ملتی ہیں اگرچہ ان میں ادبیت اتنی زیادہ نہیں، محمد علی ان سیماب ادمیوں میں سے تھے جو کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے اور کبھی ایک چیز پر قانع نہیں ہو سکتے سیاست ہو یا مذہب ادب ہو یا تعلیم وہ ہر مسئلے پر رائے دینے کے لئے تیار تھے اور ہر مسئلے سے یکساں دلچسپی رکھتے تھے، ان کی شخصیت بڑی جامع، رنگا رنگ اور دلآویز تھی، وہ بہت بزرگ آدمی نہ تھے ان کا جتنا احترام کیا جاتا ہے وہ زیادہ محض خوش فہمی اور عقیدت کی بنا پر ہے وہ بڑے خود بین بڑے متلون مزاج بڑے ضدی اور بڑے انتہا پسند آدمی تھے وہ بس کرنا نہیں جانتے تھے وہ اصول بڑے سخت بناتے مگر بعض اوقات خود بھی ان پر عمل نہ کر پاتے تھے۔ مگر ان کے خط بڑے زندہ جیتے جاگتے ہلکے پھلکے اور شگفتہ ہیں اس عالم و عالمی سب کے لئے سامان موجود ہے، محمد علی کے یہاں بناوٹ نہیں ہے ذہانت شوخی، برجستگی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مظاہرے سے آپ خوش ہونے کا جذبہ ہے، وہ فن کار ہے وہ اپنی تخلیق میں مست ہے۔

اس کے ساتھ اقبال کے خطوط ہیں جن سے دونوں کی طبیعتوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال زندگی میں تو اکثر بہکے ہیں مگر خطوں میں اپنے آپ کو لئے دیئے رہتے ہیں۔ محمد علی ہر جگہ ایک ہی ہیں وہ جب آتے ہیں تو ایک شعور کے ساتھ ان کے مضامین کی طرح خطوں میں ایک قسم کی خطابت ہے! محمد علی کے یہاں جذبے کی گرمی ہے اقبال کے خطوں میں ذہن کی روشنی، اقبال کے خطوں سے ان کی نظموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ان کے علمی و ادبی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے سیکھنے اور جاننے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے، انکی ہر شخص سے اسکی

قابلیت کے مطابق گفتگو کرنے کی عادت معلوم ہوتی ہے گویا ایک دریا ہے جو اپنے باوقار انداز سے برابر بہتا چلا جاتا ہے ان خطوں میں ظرافت اور شوخی کم ہے، حالانکہ اقبال بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ ان سے انکی زندگی کے واقعات کا زیادہ علم نہیں ہوتا، اقبال محمد علی کی طرح اپنے آپکو ظاہر نہیں کرتے، ہاں ان کی شاعری میں انکی شخصیت پوری طرح جھلکتی ہے۔ اقبال کے سارے خط اگر شائع ہو جائیں تو وہ انکی شاعری کی شرح بن سکیں گے اس سے زیادہ نہیں، محمد علی کے خطوں سے انکی شخصیت کے قریب قریب تمام عناصر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اقبال اور محمد علی کا موازنہ مقصود نہیں، دونوں کے خطوط کی خصوصیات کا موازنہ مقصود ہے۔

انسانی فطرت بڑی عجیب و غریب چیز ہے، اس پر کوئی لیبل لگانا بہت مشکل کام ہے پریم چند نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسانی فطرت نہ سفید ہوتی ہے نہ سیاہ بلکہ دونوں رنگوں کا ایک مجموعہ۔ حالات موافق ہوئے تو انسان فرشتہ بن جاتا ہے وہ نہ شیطان بات اتنی آسان بھی نہیں، وہی شخص ایک کے ساتھ فرشتہ ہے اور دوسرے کے ساتھ شیطان اور بعض اوقات ایک شخص ایک آپ کو فرشتہ سمجھتا ہے حالانکہ اس میں شیطنت کے جراثیم موجود ہوتے ہیں، ادب کی دوسری شاخوں میں شخصیت ایک نہ ایک نقاب سہارا، نشہ، جذبے کا سیلاب یا نصب العین کا سنہرا رنگ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ خطوں میں جہاں بے تکلف دوستوں سے باتیں کرنی ہوتی ہیں۔ یہ نقاب خود بخود اتر جاتا ہے کچھ لوگ بے حیائی میں بھی نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ اپنی بیوی تک بھی ایک لیڈر کی شان سے گفتگو کرتے ہیں، شعر پڑھ کر جان دینا چاہتے ہیں جیسے کچھ لوگ سوتے میں بھی عینک لگائے رہتے ہیں۔ مگر خط کی خوبی یہ ہے کہ یہ نقاب اتر ہی جاتا ہے پھر جو شخصیت سامنے

آتی ہے وہ ساری شخصیت نہیں مکمل نہیں مگر اس کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ
ہے اس دنیا کے معیار دوسری دنیاؤں سے مختلف ہوتے ہیں۔

بعض شاعر جس طرح نثر میں دو سطریں نہیں لکھ سکتے یا بعض فن کار جس طرح
گفتگو کی دنیا میں بالکل بدھو معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح خطوں کی دنیا میں بھی
شہرتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ داغ کی شاعری دیکھئے اور ان کے خط پڑھیے
کوئی نسبت نہیں: جوش کی شاعری میں گرمی ہے ولولہ ہے رقص حیات ہے مگر ان کے
خطوط میں لطف و انبساط نہیں۔ جوش نثر نہیں لکھ سکتے۔ وہ بہت جلد خفا
ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسرے پوری طرح کھلتے نہیں۔ انہیں اپنے سے محبت ہے
مولانا احسن مارہروی کی شاعری پھیکی اور بے کیف ہوتی تھی ان کے خط بڑے
مزے دار ہوتے تھے۔ خاکسار بیا بڑے اچھے مضمون نگار ہیں۔ مگر ان کے خط ان
کے مضامین سے بھی زیادہ جاندار ہیں۔ رشید صدیقی کا آرٹ سب سے زیادہ
شباب پر ان کے بے تکلف خطوں میں نظر آتا ہے۔ رشید صدیقی کے خطوط
اگر شائع ہو جائیں تو غالب کے بعد انہیں کا درجہ قرار دیا جائے ان خطوں
میں ایسے بے تکلف رواں دواں، زندہ، شوخ اور بھرپور فقرے ہیں ایسی ایسی
قلمی تصویریں ہیں، ایسے ایسے بے لاگ اور پرخلوص تبصرے ہیں جو ان
کے مضامین میں بھی نہیں ہیں۔ رشید صاحب دراصل بے تکلف دوستوں
میں کھلتے ہیں۔ وہ اپنا دل اپنی آستین پر نہیں لئے پھرتے ہیں وہ ہر مجلس
کی جان اور مشاعرے کی روح بننے کو آمادہ نہیں ہیں۔ مگر جن لوگوں سے وہ
بے تکلف ہیں ان کے لئے ان کے خطوں میں بڑی زندگی اور رنگینی ہے۔

رشید صدیقی کے خطوں میں پر تکلف اور مصنوعی سنجیدگی نہیں ہے
وہ لیڈر نہیں اچھے رفیق ہیں اور زندگی کی اونچ نیچ یہاں تک کے اپنی

اونچ نیچ پر ہنس سکتے ہیں۔ پھر اور طنز نگاروں کی طرح ان کے یہاں زخموں کی بہار نہیں، لالہ و گل کی بہار ہے۔

رشید صدیقی کے خط بار بار پڑھے جا سکتے ہیں اور اپنی دلچسپی نہیں کھوتے مولانا عبد الماجد کے مضامین میں جو جذباتیت ہے وہ خطوں میں غائب ہو جاتی ہے، وہ کبھی دلچسپ خط اس میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

غرضیکہ یہ دنیا کبھی بڑی دلچسپ پر آسرار اور رنگا رنگ ہے گو اس میں وقتی جذبات اور فوری کیفیات کی مصوری زیادہ ہے کردار اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے خطوں کا مطالعہ بہت مفید ہے، مگر صرف خطوں پر بھروسہ کرنا اسی طرح خطرناک ہے جس طرح صرف گفتگو پر۔ دونوں میں زندگی ہے۔ مگر استواری لازمی نہیں۔

انگریزی شاعری[1]

اردو شاعری پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس کا سارا سرمایہ بدیسی ہے اس کی اپنی چیزیں کم ہیں ایک زمانہ میں اس پر بھاشا کا اثر تھا پھر فارسی کا غلبہ ہوا، اب انگریزی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس قسم کا اعتراض ہر زبان کی شاعری پر ہو سکتا ہے جس طرح کسی قوم کا تہذیب و تمدن آسمان سے نازل نہیں ہوتا بلکہ یہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کی ایک دوسرے پر عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں کوئی ادبی سرمایہ ایسا نہیں جو کسی قدیم ادب کا ممنون نہ ہو اپنے ادب کے سوتوں کے لیے ہمیں بعض پراکرتوں اور عربی و فارسی کے خزانے کھنگالنے پڑتے ہیں، انگریزی ادب پر بھی یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن ادب کا بہت گہرا اثر ہے یہ ضرور ہے کہ چونکہ انگریزی ادب آٹھ سو سال سے زیادہ سرپا چکا ہے، اس لیے اس میں بعض اپنی خصوصیات آگئی ہیں جو اس کی اپنی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں اور جو آئینہ ہیں انگریزی قوم کی تاریخ اس کی تہذیب اور اس کے تمدن

---

[1] اس مضمون میں کی کتاب (P F E C A P O E M) سے خاص استفادہ کیا گیا ہے۔

کا مگر یہ خصوصیات علیحدہ ہوتے ہوئے بھی مشترک ہیں۔ دراصل مختلف زبانوں کے شعر و ادب ایک دوسرے سے جداگانہ بھی ہیں اور قریب بھی ایک ہی جذبہ ہے جو مختلف بہاریں دکھاتا ہے، ایک ہی تاثر ہے جس کی رنگینیاں بے شمار ہیں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت محض صوفیوں کی بازی گری نہیں ایک ادبی اصول کی تفسیر بھی ہیں۔

انگریزی شاعری کہنے کو چاسر سے شروع ہوتی ہے مگر اس سے صدیوں پہلے قدیم انگریزی یا اینگلو سیکسن میں ہمیں مذہبی نظمیں ملتی ہیں۔ شاعری پیدا تو سحر کی گود میں ہوتی ہے مگر مذہب کے سائے میں پروان چڑھتی ہے یہ شاعر سے بہت پہلے موجود تھی جس طرح دریا کی روانی اور قوس قزح کے رنگ ابر چاند کی ہلکی اور لطیف روشنی موجود تھی چنانچہ انسانوں نے بچپن ہی میں تو دو تعبیر یا رنگ و بو کا اثر اپنے دل میں محسوس کیا۔ احساس کے اظہار نے اسے شاعر بنایا مگر چونکہ احساسات سیدھے سادے تھے اس لئے ان کا اظہار بھی سیدھے سادے انداز میں ہوا قدیم شاعر فطرت سے ڈرتا تھا اور تقدیر کا قائل تھا۔ مگر چونکہ فطرت کی گود میں پلا تھا اس لئے اس سے لگاؤ بھی رکھتا تھا، شمالی ہواؤں کی تیزی، برف و باراں کی سختی زندگی کی شدید کشمکش، ان چیزوں نے اس کے مزاج کو چڑچڑا نہیں بنایا بلکہ اس میں مردانگی پیدا کی، ایک تلخ واقعیت کو پیدا کیا۔ قنوطی رنگ اور تقدیر پرستی قدیم نظموں میں بہت نمایاں ہیں یہ قنوطیت شمالی قوموں میں فطری ہے مسیحی تعلیم نے اپنے فلسفہ گناہ سے اسے گہرا کر دیا۔ اس زمانہ کا شاعر اپنی چند روزہ زندگی کا پورا احساس رکھتا تھا مگر آنے والی زندگی سے ڈرتا بھی تھا۔ یہ شاعری پوری قوم سے بلکہ یوں کہئے پوری قوم پوری

قوم کے لیئے ضروری تھی قوم نے اسے اپنایا اپنی زندگی میں جگہ دی اور ایک
زندہ روایت کی طرح آنیوالی نسلوں کو سونپا۔ شاعری اس وقت کتب خانوں یا حکومتوں
یا دل کی خاموش گہرائیوں کے لئے نہ تھی، محفلوں جلسوں اور ہنگاموں کیلئے تھی
انداز میں سادہ، استعاروں سے بے نیاز، مافوق الفطرت جذباتیت سے
خالی واقعیت سے لبریز ایک امید پرور تصور میں ڈھلی ہوئی یہ ہے
جاسر سے پہلے کی شاعری، اسمیں میٹھی لوریاں بھی ہیں اور جادو ٹونوں کے ذکر
بھی ہیں، اور ایک جملہ یا فقرہ آخر میں دہرایا بھی جاتا ہے، اسے سنگیت
میں اسب گاتے ہوں گے قدیم اردو میں مثنویوں کی کثرت اور ان میں مذہبی
رنگ، ہم انگریزی کے اس دور سے ملتی جلتی سی چیز ہے، مگر یہاں فطرت نے
محرک کا اسراع سے ہے۔ اور وہاں فطرت کی آغوش ہر وقت میسر ہے اردو
کے قدیم شاعر کا زمانہ انگریزی کے اس دور سے بہت بعد کا ہے۔ اب تک
انگریزی میں جو شاعری ہوتی تھی وہ سنانے یا گانے کے لئے تھی آگے چل
کر ہمیں ایسی ملتی ہے جو پڑھنے اور آنے والی نسلوں کیلئے چھوڑ جانے کی ہے
اس سے شاعری اور سامع دونوں میں فرق ہو گیا، شاعر کی صورت بدلی اور شاعر
کا لہجہ اس کا حلقہ اب اس کے معاصرین سے بڑھ کر آتے والی نسلوں تک وسیع
ہو گیا جاسر کو لوگ جتنا پرانا سمجھتے ہیں، اتنا پرانا وہ نہیں ہے وہ پرانے
اور نئے زمانے کے بیچ میں کھڑا ہے۔ اس نے انگریزی شاعری میں بہت
سی نئی چیزیں داخل کیں۔ اس کے یہاں تیز اور نئی بحریں ہیں۔ ان میں وہ اپنے
مواد کو زیادہ بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے اور انسانوں، قدروں کو انسانیت
کے نقطہ نظر کو انسانیت کے نصب العین کو سب سے پہلے انگریزی شاعری میں پیش
کرنا چاہتا تھا لیکن انگریزی شاعری میں انسان کو اسٹیج کے بیچ میں آنے کا موقع نہ ملا

تھا اب اس نے اپنے آپ کو پہچاننا اور پانا چاہا اور اپنے آپ کو پانے کی
کوشش میں اپنے گرد و پیش کی دنیا کو پہچانا چنانچہ وہ دنیا جو پہلے تاریک غم
اور غم آلود نظر آتی تھی اس نئی دریافت کے بعد اس سے رنگین اور حسین معلوم
ہونے لگی۔ چاسر کے یہاں انسانیت HUMANISM کی بہت سی خصوصیات
ملتی ہیں اسکے کردار، شخصیت، مزاج سے جو دلچسپی ہے وہ اسی قسم کی ہے اسکا
علم، اس کی ہمہ گیری اس کی خوش طبعی اور زیر لب تبسم سب اسکی انسانیت کی دلیل
ہیں۔ مگر وہ آئندہ زمانے کا ہے نہ پچھلے کا، دونوں کا عجیب داستعمال اس
کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

انگریزی شاعری کا سب سے پہلا اور مکمل نمونہ اس کے دو برس بعد ہمیں
اسپنسر کے یہاں ملتا ہے۔ انگریزی شاعری کے لباس وصورت پر اسکا بہت
گہرا اثر ہے، دراصل اسی نے اس کی بنیاد ڈالی اس نے کلاسیکل اور رومانی
ذخیرۂ ل سے مدد لی بول چال کا خمیر تیار کیا شکسپیر کی عجیب وغریب شخصیت
نے اس سے انگریزی کا خمیر تیار کیا شکسپیر کی عجیب و غریب شخصیت
نے اسپنسر کی عظمت کو دھندلا کر دیا، یہ شخص انگریزی الفاظ کی موسیقی
ان کی لوچ ان کی روح سے واقف تھا، یہ چاسر کی خالص انگریزی
چاشنی کو پہچانتا تھا، اس نے جو نغمہ بکھیرا وہ فضا میں بکھر گیا، اس کے
تمام معاصرین اس سے متاثر ہوئے، ملکہ الزبتھ کے دور کو انگلستان کا
زریں دور کہنا فیشن ہو گیا ہے اس وقت شاعری میں بھی ایک نئی روح دوڑ
گئی تھی، قومیت کا جذبہ، فرد و مباحات خیالات میں وسعت اور بلندی
جوش، رقص اور گرمی جو صنائع بدائع کے باوجود جھلکی پڑتی ہے، اچھے
اچھے رنگا رنگ کے پھولوں کا ایک جنگلی جہاں ہر خوشبو تیز ہے رنگ،

بہت شوخ ہے اور بہت بے ڈھنگی، یہ باتیں شکسپیر کی ہمہ گیر شخصیت میں بھی ہیں اور مارلو کی
تند و تیز شراب میں بھی ہیں اور جانسن کے بوڑھے فلسفہ میں بھی انگریزی شاعری کو اس
دور نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا پہاڑ کا چشمہ جس طرح اپنی تیزی میں بڑی بڑی چٹانوں کو بہا
لاتا ہے. اسی طرح اس دور کے شعراء کے کلام میں سب کچھ ملا جلا ہے مگر انھیں شعریت گرمی اور
گھلاوٹ موجود ہے شاعری پہلے خارجی چیزوں کی مصوری پر قانع تھی۔ اس دور میں داخلی
رنگ بھی آیا، ذاتی جذبات بیان ہوئے زبان کی زرخیزی اور گہرائی دریافت ہوئی رنگینی
بھی آئی اور رعنائی بھی، شکسپیر سے زیادہ انگریزی شاعروں پر اسپنسر کا اثر ہے شکسپیر نے شاعری کو
آگے بڑھایا، اسپنسر نے شعراء کو متاثر کیا.

ہمارے یہاں اس دور کے مترادف کوئی چیز نہیں ہے۔ آزاد نے ولی کو اردو چاسر
کہا ہے اس لحاظ سے تو یہ صحیح ہے کہ دونوں اپنی زبان کے بڑے شاعر ہیں مگر اپنے اثر کی گہرائی
اور گیرائی کے لحاظ سے ولی اور اسپنسر زیادہ قریب ہیں دونوں نے اپنے بعد کی شاعری
کے سانچے بنائے۔ دونوں کی خصوصیت روایت بن گئی ہیں اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہوتا
ہے کہ ایک زبان کے شاعر اور دوسری زبان کے شاعر میں پوری یکسانیت نہیں ملتی چند ہی
باتیں مشترک ہوتی ہیں.

الزبتھ کے دور کے بعد انگریزی شاعری میں کئی رجحان آ گئے تھے، اسپنسر نے قدیم کلاسیکل
بحروں کو نئے انداز سے برتا تھا اس نے شاعری میں ذاتی جذبات کی مصوری کی تھی اس نے اور شکسپیر
نے استعارہ سے کام لے کر انگریزی شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کیا تھا اور معنی آفرینی اور حسن آفرینی
دونوں کی مثالیں پیش کی تھیں کہیں کہیں تندی صہبا سے اس کا آبگینہ پگھل جاتا ہے
اور الفاظ ایک دوسرے سے مل کر خیال کو اور بھی نشیلا بنا دیتے ہیں۔ مگر اس نشہ کے بعد خمار
بھی ضروری تھا۔

سترھویں صدی میں ملٹن، ڈان اور ڈرائیڈن تین نام خاص طور پر قابل ذکر

ہیں۔ ملٹن میں حقیقت میں صرف سترھویں صدی کا نہیں، وہ جہاں کھڑا ہے تنہا ہے۔ دنیا والوں سے بے نیاز خدا کے راز انسان پر اور انسان کے خدا پر منکشف کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے دور پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑتا شاید اس لئے کہ اس نے اپنے دور سے بہت آگے دیکھا تھا۔ مگر ڈان کی تکنیک اس زمانے کی ہے ڈان مابعد الطبیعاتی شعراء کا سرگروہ ہے اس نے انگریزی شاعری میں سب سے پہلے فلسفہ و شعر کا ملاپ کرایا اس نے ثابت کیا کہ جو مواد فلسفہ کا ہے وہی شاعری کا بھی ہے۔ وہ جذبات کی شدت اور جوش کو باقی رکھتا ہے ان کو قائم رکھتا ہے اور خیال کی پرواز میں بھی جذبات کی شدت اور جوش کو باقی رکھتا ہے وہ عشق و محبت کو بھی فلسفہ بنا کر پیش کرتا ہے اور فلسفہ میں عشق و محبت کی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ انگریزی شاعر کا یہی تصوف ہے، ہمارے یہاں حال کی بازی گری ہے وہاں خیال کی۔

سترھویں صدی کے وسط سے اٹھارویں صدی کے آخر تک انگریزی شاعری پر جو دور گزرا وہ شائستگی، صفائی، عقلیت، متانت اور تہذیب کا تھا فطرت کو پابند کیا گیا، قدما کے طرز پیاو رجلا کی گئی۔ اس میں چمک آگئی، تیزی نہ آئی تہذیب آگئی، گرمی نہ آئی، ادائیں آگئیں حسن نہ آیا، ڈرائیڈن اور پوپ اور جانسن نے تجربے بھی کئے لیکن ان کا نقطہ نظر قدیم سا وہ شاعری میں لہجہ کے وقار اور جذبات کی متانت پر زور دیتے رہے انکے کلام سے شاعری کی روح اسکی تھرتھراہٹ اس کی لطافت کم ہو گئی۔ ان میں کونٹ اچھے شاعر تھے مگر ان کی شاعری بہت بلند پایہ نہیں ہے کانگریس کی ہیروئنوں کی طرح ان کی سب ادائیں مصنوعی ہیں۔ یہ شعرا ڈرائنگ روم اور دربار کے لئے ہیں۔ شکسپیر نے بھی دربار سے اپنا تعلق رکھا تھا مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اس کی آزادی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا تھا ان کے جذبات کی باگ عقل کے ہاتھ میں فطرت انسان کے خانہ باغ میں بند ہو گئی

ہے ویسے ہی جیسے ہمارے ہاں کے لکھنوی شاعر دونوں صنعات اور مرصع سازی کے قائل ہیں۔ روح اور جذبے کی اتنی پروا نہیں کرتے۔

ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں کہ اس مصنوعی باغ اور اس مصنوعی شہر سے کبھی لوگوں نے منہ موڑا اور تبدیل آب وہوا کیلئے جنگل کی راہ لی (Keats) نے ایک نیا مندر بنایا اور ڈسورتھ نے بعض بھولے ہوئے دیوتاؤں کا راگ گایا، کولرج ایک بوڑھے بحری کے ساتھ دور دراز سمندروں کی سیر کو گیا اگرچہ وہاں سے بھوت رو کر لوٹا نوجوان کیٹس ایک اور بے رحم عورت پر عاشق ہوا اور اس کے ساتھ خیال کی حد سے آگے نکل گیا، فرشتہ صفت اور معصوم شیلے ساری عمر خیالی دنیا کو حقیقت سمجھتا رہا پہلے پہلے لوگوں نے ان پر قہقہے لگائے، انہیں گمراہ بنایا ان کے کہنے پر کان نہ دھرے مگر جلدی وہ بھی اس رو میں بہہ گئے پھر ایا کیا تھا ویرانے میں نئے نئے پھول کھلنے لگے اور اس جنگل میں منگل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں عمارتیں بنیں، محل تیار ہوئے انہیں آراستہ کیا گیا۔ ان میں بڑے بڑے باغ لگائے گئے یہاں تک کہ ان پھولوں کی مہک بار بار چھونے اور سونگھنے سے زائل ہو گئی اور ٹینی سن جیسے صناع پیدا ہوئے جو ایک وقت حسن کی دیوی اور ملکہ وکٹوریہ دونوں کے پجاری تھے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ نئے سماج بنانے والے تو چند ہی ہوتے ہیں۔ یہ نئے سانچے نئے خیال کی نئی تصویریں پیش کرتے ہیں مگر دوم درجے کے لوگ سانچے کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں یہاں تک کہ ان کی وجہ سے سانچہ بھی بیکار ہو جاتا ہے ٹینی سن اپنے دور کا بہت اچھا ترجمان ہے وکٹوریہ کے عہد کا سارا بلند آہنگ مگر کھوکھلا فلسفہ ساری لفاظی، اخلاقی ادب سیاسی عظمت کا سارا طلسم ٹینی سن کے یہاں موجود ہے اسے شباب کے بدلے میں موت ہی آئی۔ حیات ابدی کہاں ملتی ہے، ہاں براؤننگ کے یہاں چونکہ خیال کی گہرائی اور ایک منفرد تجربہ ملتا ہے اس لئے اس کی مقبولیت زیادہ دیر تک رہی مگر ان

اونچے اونچے سربفلک محلوں میں بھی زلزلہ آنا ضروری تھا، چنانچہ جلد ہی روزن ظاہر ہونے لگے، انہیں میں سے بعض نے بغاوت کا علم بلند کیا میتھو آرنلڈ نے لاکھ روحانیت اور تہذیب نفس کا جادو جگانا چاہا، مگر زمانہ بدل چکا تھا، انیسویں صدی کے آخر میں ہی اس دور سے بیزاری شروع ہو گئی۔

جنگ عظیم سے پہلے اس بیزاری نے زیادہ تلخی اختیار نہ کی تھی، جنگ نے وہ اخلاقی نصب العین وہ سیاسی نظریہ، وہ معاشی تصور۔ وہ صحافتی نقطہ نظر سب کو برباد کر دیا، اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی توپوں کی گھن گرج اور میدان جنگ کی ہلاکت آفرینی نے صدیوں کے پردے سالوں میں بلکہ دنوں میں اٹھا دیئے، جنگ کے بعد جو عیش پرستی آئی، اتنی اہم نہیں ہے جتنی وہ طنزیاتی روح، وہ نفسیاتی تجربہ، وہ حقیقت سے ہر قسم کے پردے اٹھا دیئے اور اس سے آنکھیں چار کرنے کی خواہش جو ہمیں دونوں بڑی لڑائیوں کے پیچھے سارے ادب میں ملتی ہے۔

شاعری پیدا سحر سے ہوئی، مذہب کی گود میں کھیلی، عقلیت کے سائے میں کیا پروان چڑھی، مناظر قدرت کے ساتھ جوان ہوئی کیا پروپیگنڈے کے دور میں یہ باقی رہ جائے گی؟ یہ وہ اعتراض ہے جو مکالے نے شاعری پر کیا تھا جب کبھی اس قسم کا خطرہ شاعری کو لاحق ہوا ہے تو اس نے اس خطرے ہی سے اپنے لئے بقا کا سامان پیدا کیا ہے چنانچہ انگریزی شاعری کی ترقی میں سائنس ایک دیوار کی طرح حائل نہیں بلکہ اسے مدد دینے والے اور اس کے لئے خام مواد مہیا کرنے کے لئے سائینٹفک مزاج مشینوں کے دور، ریڈیو، ہوائی جہاز، انجن آپریشن ٹیبل کو غیر شاعرانہ کہنے والے شاعری کی ترقی میں بند باندھتے ہیں ان میں ایک آہنگ یا شعریت ہے۔ شاعری ان سے کچھ نہ کچھ اخذ کر سکتی ہے (۵۲ ا ۵۷ ا ۳ س)

کی ایک مشہور نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

(LETUSGOTEN YOU ANOM
WHEN THE EVENINGIS SPREADOUT
AGAINST THE SKY
LIKE APATIENT ETHENIZEOHPON
ATABLE

چنانچہ جدید شعرا، مثلاً (SPENDER. AUDEN -C. DAYLEWIS)
وغیرہ کے یہاں بجلی کے تار، دن انجن کی بھاپ اور عظیم الشان بحری قوتوں سے تشبیہہ
و استعارے اخذ کئے گئے ہیں (ELIOT) مابعد الطبیعاتی شعراء سے زیادہ
متاثر ہے۔ ہر دور کا ایک فلسفی ہوتا ہے اس دور کا فلسفی (T.S. ELIOT) ہے
اس کی نظم خرابے کا ترجمہ ہمارے رسالہ اُردو میں چھپ چکا ہے "اس میں اور
دو کھو کھلے آدمی ہیں" اس دور کی مایوسی اور تلخی پورے طور پر موجود ہے
چاہے وہ ایلیٹ کا SANDRELL یا کیلے کا PRUEFROEK دونوں بس
ذہن ہی ذہن رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ کھو چکے ہیں اور اتنا ذوق یقین نہیں رکھتے
کہ کچھ پا سکیں، ہمارے یہاں چونکہ اتنی تڑپ خلش اور آرزو نہیں ہے اس لئے
ہم ان کا تصور بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ ایلیٹ تو خیر فلسفی ہے، اور فلسفی
ادھر یا ادھر نہیں ہوتا، وہ محض بلند ہوتا ہے مگر (SPENSER اور AUDEN
اور MACNIECE کے یہاں آگے کی طرف رجحان ہے وہ آگے بڑھنا چاہتے
ہیں اور اس لئے ان میں یقین کی جو چنگاریاں ہیں انہیں پھونک کر دھکاتے
ہیں مگر ان کے لئے کچھ ہونا نہیں۔

جب اسپین کی جنگ شروع ہوئی تو یورپ کے بہت سے ترقی پسند شاعر

اور ادیب جمہوری حکومت کے ساتھ تھے انہوں نے میڈرڈ کی حفاظت میں جانیں دیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر حکومت کو شکست ہوئی اور اٹلی اور جرمنی کے لیڈر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ان ترقی پسندوں نے یہ تو دکھا دیا کہ جب دو اصول آپس میں ٹکراتے ہیں تو لڑائی بڑی خوفناک ہوتی ہے مگر اس سے فائدہ بھی ہوتا یا نہیں یہ وہ ثابت نہ کر سکے یہ وہ فاشیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہو سکے۔ شاید بعض ادیب اور شاعر انگلستان چھوڑ کر امریکہ گئے تو ان کے ذہن میں اس دنیا اور دور کی تباہی نہیں اپنے مشن میں ناکامی کا خیال بھی تھا ان پر میدان چھوڑ کر فرار کا الزام لگایا گیا مگر کیا یہ میدان واقعی اس قابل تھا کہ اس کی خاطر جان دی جائے اسے کوئی پوری طرح ثابت نہ کر سکا۔ بہر حال انگریزی شاعر کے پاس اگر ہمارے درد کا علاج نہیں ہے تو یہ احساس تو ہے کہ اس کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نئی دنیا کا تصور ہی لے دے کے تسکین کا باعث رہ جاتا ہے اسی سے لو لگائے بہت سے بیٹھے ہیں۔

غرض انگریزی شاعری ایک وسیع ذخیرہ اور شاندار میراث کی مالک ہے اس کے پاس آٹھ سو سال کی روایات اور اس دور کی مشغول، مضطرب اور ہنگامی زندگی کی ساری شدت اور تیزی اور زہرناکی موجود ہے۔

وہ ایسے ماحول میں پلی ہے جو قدامت پرست ہے مگر جہاں ہر طرف سے ہوائیں آجاتی ہیں اور جہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے اسی وجہ سے موجودہ صورت حال کو تو آپ مرض الموت کہہ سکتے ہیں اور نہ وضع حمل کی تکلیف، مگر انجام کچھ بھی ہو۔

انگریزی شاعر اگر انجام کو بدل نہ سکا تو اسے کم از کم گوارا بنا دیگا۔

یہ اس لئے کہ وہ اس بھول بھلیوں میں بھی حقیقت کا متلاشی ہے اور اس راز کو پالینے کی جستجو اس کے قول میں ابھی تک موجود ہے۔

دوسرے الفاظ میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہ کیا کہتا ہے اور اسے کیا کہنا ہے۔

ہمارے یہاں جو کہتے ہیں اسے سمجھتے نہیں اور جو سمجھتے ہیں اسے کہہ ڈالنے کی جرأت نہیں پاتے۔

(۱۹۳۹ء)

ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

اُردو ادب میں حالی کا کیا درجہ ہے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے
حالی کے کارنامے بہت ہیں اور ان کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے وہ شاعر بھی ہیں
اور نثار بھی نقاد بھی ہیں اور ان کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے وہ شاعر
انہوں نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں وہ غزل کے خلاف ہیں لیکن انکی بہت
سی غزلیں اُردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان غزلوں میں ہجر اور
وصل بھی ہیں اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی۔ مگر صرف یہی نہیں اس کے علاوہ بھی
بہت کچھ ہے۔ ان نظموں اور میں اسلامی تعلیم اور اصلاحی پیغام ہے۔ مگر تاثیر اور
شیرینی بھی کم نہیں وہ واعظ بھی ہیں اور مصلح بھی ناصح بھی اور حکیم بھی مگر دراصل
وہ شاعر ہیں۔ اسے غالب نے بھی تسلیم کیا تھا اور آج بھی ہر صاحب فہم مانتا ہے۔
نثر میں ان کے کارنامے کچھ کم روشن بھی نہیں وہ تین بلند پایہ کتابوں کے
مصنف ہیں جو اُردو ادب میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید سوانح عمریاں بھی ہیں
اور تنقیدیں بھی ان کے علاوہ بھی حالی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں اپنی

نظموں پر دیباچے اور اپنے دیوان پر مقدمے تحریر کئے ہیں، تقریریں کی ہیں۔ مقالے پڑھے ہیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو خط لکھے ہیں۔ اور آج یہ سب چیزیں ارباب کی آنکھوں کا سرمہ ہیں۔

انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ سے اُردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی، شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور جمالیاتی نظریہ مرتب کیا پھر اس نظریہ کی روشنی میں اُردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی پر علیحدہ علیحدہ ناقدانہ نظر ڈالی۔ ہماری تنقید کے جو سانچے ہیں وہ حالی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہم جن چیزوں پر آج زور دیتے ہیں ان کی طرف سب سے پہلے حالی نے اپنے مقدمہ میں توجہ دلائی تھی۔

انہوں نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے جتنے رفیق اور ہمعصر تھے سب کے سب صاحب طرز تھے۔ لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان، سرسید کی سادگی شبلی کی رنگینی سب اپنی جگہ پر خوب ہیں لیکن آج کا نثر کا رجحان گیا ہے۔ یہ بنانے کا ضرورت ہے؟

حالی نے ہوش سنبھالا تو ہمارا ادب ایک خاص منزل پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ شاعری چونکہ آزاد الفاظ میں، فارسی کے پردوں سے اڑتی تھی۔ اس لئے اس میں ویسی ہی باتیں آ گئی تھیں جس ماں کا اس نے دودھ پیا تھا اسی کی خاصیت پیدا ہو چلی تھی، روشنی کم ہو گئی تھی۔ حسن تھا تندرستی نہ تھی بلند آہنگ نغمے تھے مگر ان میں تاثیر ناپید۔ تعالی عام تھی، ایجاد کو پسند کرنے والے کم تھے ذوق غالب سے بہتر شاعر سمجھے جاتے تھے۔ قافیہ کی خاطر شعر کہا جاتا۔ غزل محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ نثر اگرچہ نظم سے کم تر تھی مگر اس میں سجع و صنائع

رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ سرسید کی ابتدائی تصانیف اور غالب کے خطوط میں عام رنگ کے خلاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی تھی۔ حالی، غالب کے معتقد اور میر کے مقلد اور شیفتہ سے مستفید تھے۔ غالب کی شاعری سے متاثر نہ ہوئے ان کی نثر سے متاثر ہوئے انھوں نے مسدس سے پہلے جو کچھ لکھا اس کی اہمیت عام طور پر نظر انداز کی جاتی ہے۔ غالب اور شیفتہ کی صحبت عرب شعراء کا مطالعہ اور خود شاعر کی سادگی اور دردمندی ان سب باتوں کی وجہ سے حالی کی غزلوں میں بھی بہت سے نشتر موجود ہیں۔ ان کی جوانی داغ و مومن کی طرح دلیوانی نہ تھی مگر اس میں جوانی کے ساری امنگ اور ترنگ موجود ہے ان کی غزلوں کے چند شعر دیکھیے۔ انہیں سادگی ہے مگر حسن و شیرینی بھی الفاظ دھیمے ہیں مگر وہ کسک اور کھٹک ہے جو نشتر میں ہوتی ہے ؎

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت — فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا
آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا — بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
لگا کچھ نہ کچھ کہ بچیا بس ہی اک دل میں کھٹکتی — مانا کہ اس کے ہاتھ میں خبر دستاں نہ تھا
ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کسی سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
رہا ہوں رند کبھی اے شیخ پارساؤں میں — مری نگاہ میں رند و پارسا ایک ایک
لعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اور جو لوگ انھیں صرف ناروتے اور بسور نے والا شاعر سمجھتے ہیں، وہ ذرا

یہ اشعار سنیں ؎

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں کی نہیں

قافلے گذریں وہاں کیونکر سلامت واعظ
ہے جہاں راہزن و رہنما ایک ہی شخص

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل خزاں آ کے بتا دے گی وطن کس کا ہے

غرض حالی نے جب لاہور کے مشاعروں میں برکھا رت اور حب وطن کا راگ گایا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ انہیں غزل کہنا نہ آتی تھی اور نہ اس وجہ سے کہ وہ غزل سے بیزار تھے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری کو صرف غزل نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ اسے اتنا وسیع کرنا چاہتے تھے کہ وہ آفاقی ہو جائے وہ بعد میں بھی غزلیں لکھتے رہے اور ان سے وہ تمام کام لیتے رہے جو نظموں سے لیتے تھے۔ لیکن ان کی توجہ نظم پر رہی۔

برکھا اور حب وطن سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نو نیا نہ تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی بھی اسے الاپ چکے تھے مگر انکی آواز کسی نے نہ سنی تھی۔ حالی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا۔ اور انکی اور آزاد کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنی بہار دکھانے لگے۔

لاہور سے واپسی پر سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اور سرسید اسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی اپنے طرز کے

الوکھی اور نئی ہے اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے اس میں حالی نے قوم کا مرثیہ لکھا ہے مگر مرثیہ میں تعمیری شان ہے جہاں اس میں شرفا کی حالت شعراء کی پستی علم و عمل کے فقدان پر ماتم ہے، وہاں ماضی کی شان و شوکت کا وہ ولولہ انگیز تذکرہ ہے جسے پڑھ کر مایوس سے مایوس دل بھی گرما جاتا ہے مسدس میں کئی مقامات ہیں جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ عرب کی جہالت اسلام سے ہے بی حق کا نزول ان کی سیرت، ان کی تعلیم ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبہ اسلامی مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری، قرطبہ اور بغداد کی عظمت سب کا ذکر سادہ مگر بڑے پر اثر الفاظ میں ہوا ہے۔

حالی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں پھر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم بیدار ہو جاتا ہے، وہ ماضی کے شاعر کہے جاتے ہیں، مگر ماضی کی یاد میں کھو جانا ان کا شیوہ نہیں ماضی کی ہر تصویر عبرت کیلئے پیش کرتے ہیں نہ کہ عشرت کے لئے۔

مسدس کے بعد حالی نے بہت سی نظمیں لکھیں، ان میں شکوۂ ہند مناجات بیوہ اور چپ کی داد زیادہ مشہور ہیں، حالی کی شاعری کا مقصد قوم کو خیال بندی اور خیال آرائی کی دنیا سے نکال کر حال کی دنیا میں لانا تھا وہ جانتے تھے کہ شاعر کا مقصد کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیئے۔

چنانچہ انہوں نے جہاں کہیں پستی اور جہالت دیکھی تو قوم کو اسکی طرف متوجہ کیا خصوصاً چپ کی داد میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور اہمیت کو جو قدامت اور رواج پر قربان ہو چکی تھیں پھر زندہ کیا۔ اس نظم کا آغاز کس قدر شاعرانہ ہے، مگر آگے چل کر شاعری کی دیوی سارے زیور اتار کر صرف اپنی معصومیت اور سادگی میں جلوہ گر ہوتی ہے، بقول فراق کے اسکے سکوت

میں ہر یہ بیاں اور لیر دل میں سنگیت، مناجات بیوہ میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی بے مثل انداز میں کی گئی ہے، زبان ہیں وہ شہری اور دیہاتی اور امیر غریب عالم اور عامی سب سمجھ لیں، انداز وہ ہے کہ ہر دل میں بیٹھتا چلا جائے لہجہ وہ ہے جو کبھی ناصحانہ نہیں ہو پاتا، حالانکہ اس میں حالی دنیا کی محبت کو خدا کی محبت میں محو کرنے کی تلقین کرتے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ریت کی سی دیوار ہے دنیا	اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا	ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
پار کبھی اور بیت کبھی ہے	اس نگری کی ریت یہی ہے
آئیں بہت دنیا کی بہاریں	عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں	برسیں کھلیں بہت برساتیں
پیر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی	وہ جو کلی مرجھاتی کھلی دل کی

اسی کے متعلق مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر اس بدقسمت ملک کی ایک زبان ہوئی تو وہ مناجات بیوہ کی زبان ہوگی، حالی کی رباعیات میں ناصحانہ انداز کہیں کہیں زیادہ ہے لیکن کام کی بات ضرور بیان کی گئی ہے۔

نثر میں جو کتابیں حالی نے لکھی ہیں وہ پہلے سوانح نگار پھر تنقید کے مانند آتی ہیں، حیات سعدی اور یادگار غالب دونوں سوانح بھی ہیں اور تنقید بھی حیات جاوید جو سب کے بعد اور سب سے زیادہ مکمل ہے صرف سوانح سے متعلق ہے زندگی کے حالات بیان کرتے پر حالی بہت زیادہ زور نہیں دیتے تینوں کتابوں میں بہت کم صفحے حالات کی نذر کئے گئے ہیں ان کی زیادہ توجہ شخصیت اور انکے کارنامے بیان کرنے پر رہتی ہے حیات سعدی کے علاوہ باقی دو کتابیں معاصرین سے متعلق ہیں ایسے معاصرین جو انیسویں صدی کے سب سے نمایاں افراد کہے جا سکتے ہیں

حالی کو جو مواقع رفاقت سے حاصل تھے ۔ ان سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا غالب
کے حالات سرسری طور پر بیان کئے گئے ہیں چار سو صفحوں کی کتاب میں سے ۹۶ صفحے
سوانح کے تذکرے ہیں ان میں بھی بہت سے لطائف وظرائف شیفتہ اور میر
کے حالات اور غالب کے اشعار ہیں مگر دوسرے حصے میں تفصیل سے کام لیا
ہے غالب کی شاعری اپنے زمانے میں خواص ہی میں مقبول رہی عوام میں اسے پہنچانے
اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں یادگار نے بہت بڑا حصہ ان کی
تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے، وہ نہ بجنوری کی طرح غالب کو آسمان
پر بٹھا دیتے ہیں نہ لطیف کی طرح ان پر غیر ہم آہنگی کا الزام لگاتے ہیں انہوں نے
غالب کی خصوصیات گنائی ہیں سب اپنی جگہ صحیح ہیں اور تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی
فیصلہ ہے کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے انہوں نے غالب
کے مشکل اشعار کی شرح کر کے غالب کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے اور فارسی
کے بعض شعراء سے اس کا موازنہ یکطرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے، ان کی
یہ رائے کہ خسرو اور فیضی کے بعد مرزا کی لٹریری قابلیت اور جامع صفات
کا آدمی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا ۔ بہت بڑی حد تک صحیح ہے غالب کی
مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں حالی جیسا سوانح نگار اور نقاد ملا
مگر حیات جاوداں دونوں کتابوں سے اہم ہے اس میں سرسید
کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آ گئی ہے ۔

حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور ترتیب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی
ہے انکا خیال ہے کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا
بالکل صحیح ہے انہوں نے سرسید کی مذہبی خدمات میں بجا طور پر زور دیا ہے
سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار

ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا، حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو مدلل مداحی کا باب المناقب اور ایک رخی تصویر کہا گیا ہے مگر اس قسم کے اعتراضات تو باسویل کی کتاب لائف آف جانسن پر بھی کئے گئے ہیں، حالانکہ سوانح نگاری میں سنگ راہ کا کام دیتی ہے حیات جاوید اتنی مقبول نہیں ہوئی جتنی یادگار غالب اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی شخصیت سرسید کی شخصیت سے زیادہ دلچسپ ہے۔

مقدمہ شعر وشاعری میں حالی نے شعر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ خود ان کی شاعری میں پوری طرح پائی جاتی ہیں، سادگی اصلیت، جوش تینوں کی ضرورت حالی نے بڑے دلنشین انداز میں سمجھائی ہے پھر اس معیار پر انہوں نے اردو شاعری کو پرکھا ہے، غزل کے خلاف انہوں نے بڑے بڑے اعتراضات کئے ہیں اور بہت سے اشخاص اسی وجہ سے ان کے خلاف ہیں مگر دراصل ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایت لفظی اور تانک جھانک تک محدود کر دیا انہوں نے قدما کی اس لئے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر سامعین کو مسحور کرتے ہیں قصیدہ سے چونکہ مبالغہ جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کو ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے اس لئے حالی اس کی مذمت کرتے ہیں اور مرثیہ و مثنوی کی تے چونکہ اردو شاعری میں رزمیہ بزمیہ دونوں رنگ پیدا کئے اس لئے انہیں سراہتے ہیں، غرض وہ شاعری کو شخصی اور صنعتی کوچوں سے نکال کر زندگی سے قریب لانا چاہتے ہیں ان کی تنقید سے رہنمائی اور اصلاح دونوں کام انجام پاتے ہیں اس میکدہ میں جہاں شراب کا دور ختم ہو چکا تھا مگر بادہ خواری کی تھی جا کر ہوشیاری کا پیغام سناتے ہیں، آرٹ کو آرٹ کی خاطر

نہیں بلکہ اخلاقی کی خاطر زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر اسے حرکت
بلندی عظمت پیدا کرنے کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کیلئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو
آسان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، حالی سے پہلے ایک خاص طبقہ کیلئے تھا
اسی طبقہ کیلئے وہ نغمہ شادی اور نوحہ غم کا سامان بہم پہنچاتا تھا ہمارے شاعر اور
ادیب یا تو دربار سے وابستہ تھے یا خانقاہ سے کبھی کبھی دونوں سے آنکھ مچولی
بھی ہو جاتی تھی ۔ اسی وجہ سے اس میں یا تو جوانی کے چھچھلے اور ساز عشرت کے نغمے
بار و حابت اور بے ثباتی دنیا کے مضامین ہوتے تھے جھونپڑوں میں رہتے تھے وہ
ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھتے رہتے انہیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ جھونپڑوں میں محل
سے زیادہ سکون امن اور آزادی میسر ہو سکتی ہے اسی وجہ سے انداز بیان ایسا
ہونا ہے جسے محل والے پسند کرتے ہیں ۔

انیسویں صدی کے آخر میں غدر کے بعد یہ سیاسی جماعت کا مفہوم وسیع
ہوا انفرادیت کے بجائے قومی نقطۂ نظر یہ آیا اس وقت لکھنے والوں کو یہ خیال ہوا
کہ بات اس زبان میں ہو جو سب سمجھیں جس میں قابلیت کا زور اور انشاپردازی کی
شان نہ ہو بلکہ خلوص کی جھلک اور ایک بڑے مقصد کی چاشنی ہو سرسید کی نثر اور
حالی کی شاعری سے یہ مقصد پورا ہوا خیالی طوطا مینا بنانے کے بجائے کام کی بات پر
زور دیا گیا ۔ فصاحت و بلاغت کے فرسودہ اصولوں کی جگہ اپنے مطلب کو ظاہر
کرنا زیادہ اہم ٹھہرا ادب سے زندگی کے مسائل حل کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو
گوارا بنانے کا کام لیا جائے گا ۔ مہدی کا قول ہے کہ اگر سرسید کے بعد کوئی قلم
ہاتھوں میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں ادب کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ
سخت سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں یہ سلاست اور نفاست
قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی حالی

نے سرسید کے رنگ کو ترقی دی ۔ سرسید کا رنگ بہت مفید ہونے کے باوجود کبھی کبھی
بے رنگ اور سپاٹ ہو جاتا تھا۔ حالی نے اس میں ادبیت پیدا کی ۔ ان کا سپاٹ پن کا
ہے مگر ان کی مے میں شمشیر کی تیزی ہے اور یہ زبان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے
موزوں اور مناسب ہے آزاد نے بقائے دوام کا دربار آراستہ کر کے نثر میں
شاعری کا چٹخارہ پیدا کیا ان کی روح جدید تھی مگر لباس قدیم جس رنگ کے خلاف
وہ بغاوت کر رہے تھے وہ آخری دفعہ خود ان کی تصانیف میں نظر آیا۔ یہ
خیالی مضامین یا مرقع نگاری کیلئے موزوں تھا لیکن علمی اور تنقیدی مضامین
کیلئے اس میں گنجائش نہ تھی نذیر احمد کے طرز میں مذاق کا پہلو نمایاں ہے اور
باوجود بہت پر زور بہت تندرست ہونے کے محدود ہے کہانیوں اور
لیکچروں میں مزہ دیتا ہے، مذہبی تصانیف میں نظر ڈالتے گر جاتا ہے شبلی نے اپنے
ہمعصروں سے بہت کچھ سیکھا ہے، آزاد کی رنگینی حالی کی سادگی سرسید کا استدلال
نذیر احمد کا زور بیان، سب اپنی اپنی جگہ ان کے ہاں ملتے ہیں۔ مگر یہ رنگ علماء
ہے اس کے قدرداں ہمیشہ رہیں گے بلکہ پڑھے لکھوں میں ہمیشہ مقبول رہے گا۔
مگر حالی کی سی ہمہ گیری اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، حالی اپنے آپ کو باغ کے پھولوں
سے نہیں سجاتے، بلکہ ان کے یہاں وہ رنگینی ہے جو خون جگر سے پیدا ہوتی ہے
ان کا طرز رواں متین اور سنجیدہ ہے اس میں انگریزی کے الفاظ بے ضرورت بھی آگئے
ہیں مگر عام طور پر دوسری زبانوں کے الفاظ خصوصاً ہندی کے نرم اور
شیریں الفاظ سے انہوں نے ایک خاص آہنگ پیدا کیا ہے۔ تازہ ہوا سے منہ
موڑ کر نہیں بیٹھتے، بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں کبھی
خامیاں ہیں، ان کے اخلاقی نقطہ نظر کہیں کہیں اس قدر نمایاں ہیں کہ شاعری گویا
کر پناہ مانگنے لگتی ہے، ان میں وہ والہانہ کیفیت وہ خودسپاری ز (ABNDON

نہیں غنائی شاعری کی جان ہے (SENSE OF WONDER) یا ہیں یا نہیں جو جگر کی بعض غزلوں میں ملتا ہے وہ چمک اور چمک (FLASHES) ہیں یا نہیں جو غالب یا سودا یا اقبال یا انشا وغیرہ میں موجود ہے مگر ان کے یہاں حیرت انگیز توازن، حیرت انگیز گہرائی، حیرت انگیز اثر موجود ہے وہ جدید شاعری کے پیمبر اور اردو کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ ان کے زمانے میں ہمارے ادب میں بہت سے باغ لگائے گئے اور بہت سی راہیں کھلیں مگر سب سے زیادہ پھل پھول ان کے باغ میں اور سب سے زیادہ وسعت ان کے راستے میں آئی جب انہوں نے دوکان لگائی تو اگرچہ ان کا مال تابانیں تھا مگر اکثر گاہک بے خبر تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب کو خبر ہوتی رہی اور آج جس مال پر حالی کی مہر نہیں وہ ٹکسال سے باہر سمجھا جاتا ہے۔

حالی سے پہلے ہمارے شاعر اور ادیب اپنی جنت الگ بنائے اسی میں محور رہتے تھے۔ حالی نے جنت عدن میں رہ کر نجد کی لپٹ محسوس کرنا سکھایا وہ نجد کی گرم ہواؤں میں جنت کی لطافت نہ پیدا کر سکے یہ اقبال کا کام تھا جو ان کے صحیح معنوں میں جانشین ہیں۔

(۱۹۴۰ء)



اکبر
شخصیت اور آرٹ

اکبر کی شخصیت اور آرٹ کے صحیح تصور کیلئے ان کے زمانے کو پیش نظر
رکھنا ضروری ہے یہ زمانہ گذر چکا ہے اگرچہ اس کے دھندلے
نقش ابھی باقی ہیں انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جس میں وضع
داری زندگی کی سب سے بڑی نعمت تھی اور مشرقیت مذہب کا جزو بن گئی تھی پھر ان
کی آنکھوں کے سامنے ایک سیلاب آیا اور ان کے دیکھتے دیکھتے وہ سب کچھ جسے وہ
عزیز رکھتے تھے اس کی رو میں بہنے لگا۔ اکبر نیک بخت بھی تھے اور تھوڑے سے
تنگ نظر بھی طوفان آتے دیکھا تو سمجھے کہ سب کچھ فنا ہو جائے گا، یہ بھول گئے کہ
اس کے اثر سے زمین زرخیز بھی ہو جائے گی۔

وہ الہ آباد کے قریب شرفا کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے خاندان
شریف تھا مگر مالی حالت خراب تھی انہوں نے شرافت کو اوڑھنا بچھونا بنانے
کے بجائے ایک معمولی سی ملازمت کر لی جس سے ترقی کرتے کرتے رفتہ رفتہ
بہت اونچے عہدے پر پہنچ گئے امل خوانی سے شروع کر کے ججی تک پہنچے، دولت
شہرت عزت سبھی کچھ حاصل ہوئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا، ہر رنگ کی

پیر کی ہر در و بام کو جھانکا، مشاعروں میں شرکت کی صوفیوں کی صحبت اٹھائی
خود جہاں رہے جان محفل رہے بہت وسیع حلقہ احباب تھا، سب کے ساتھ بڑی
محبت اور اخلاق سے پیش آتے تھے، شروع شروع میں رنگینی اور رندمشربی شعار تھی بعد
میں مذہبیت بڑھ گئی تھی، سرکاری ملازمت کی وجہ سے جو کہنا چاہتے تھے صاف صاف
نہ کہہ سکتے تھے پردے پردے میں حال دل بیان کرتے تھے وہ احتیاط آخر تک
قائم رہی مرتے وقت تک اپنے آپ کو مدخولہ گورنمنٹ سمجھتے رہے مگر دل کہیں
اور تھا کبھی بدھو میاں کبھی گاندھی کی گوپیاں اپنی طرف کھینچتی تھیں سب سے خوشگوار
تعلقات رکھنا چاہتے تھے اس وجہ سے منہ پر کسی کو کچھ نہ کہہ سکتے تھے مگر اپنے
خطوں میں اپنے دل کی بات بیان کی ہے ان کی شخصیت بڑی دلچسپ، بڑی
متنوع اور بڑی رنگارنگ تھی، ہر صحبت میں اپنے اشعار سے فقروں سے برمحل
اور برجستہ جملوں سے لوگوں کو ہنساتے تھے خطوں میں اپنی پریشانیوں کا
ذکر زیادہ ہے وہ چاشنی کم ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام زعفران زار ہے

کلام میں پہلے پہل تو آتش اور اپنے استاد وحید کے اثر سے عاشقانہ واردات
رعایت لفظی اور بندش کی چستی کی طرف توجہ ہے مگر رفتہ رفتہ طبیعت
کا اصلی رنگ ظاہر ہونے لگتا ہے بعض نقادوں نے اکبر کی شاعری کے پانچ
دور قائم کئے ہیں لیکن سہولت کیلئے تین دوروں میں تقسیم ہو سکتی ہے ۱۸۸۴ء
تک پہلا دور ہے اس میں عشق کی حرارت اور جوانی کی شورش ہے۔

یہ رعایت لفظی اور اخلاقی تعلیم صاف آتش کے اثر سے آئی ہے ندرت
بیان حیرت انگیز ہے اس کی وجہ سے انہیں ظرافت میں بڑی مدد ملی ہے۔

۱۸۸۴ء سے ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ ان کے نصب العین اور اسلوب دونوں
کی وجہ سے اہم ہے اس کی وجہ سے اکبر، اکبر ہوئے اور اس کے بعد ظرافت کم اور

تصوف وروحانیت زیادہ ہوجاتی ہے مگر جس طرح شراب منہ سے لگی ہوئی چھٹتی نہیں اسی طرح ظرافت بھی آخر تک موجود ہے۔

اکبر کے آرٹ کا کمال ان کے فن کی انتہائی بلندی ان کی شاعری کی معراج ۱۸۸۴ء سے ۱۹۱۲ء تک نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو پا نہ سکے تھے اس کے بعد وہ شاعر سے زیادہ صوفی اور اللہ والے بن گئے تھے ان کے آرٹ کو سمجھنے کیلئے خود انہیں کے چند اشعار مدد مل سکتی ہے ؏

بار خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد بُرا	دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی
گو اپنے ساتھ آپ کا ہر آنہ لگے گیا	اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا
سر دتھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برفبار	شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف
شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں	دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں
تا بید وضع ملت و دیں کی کریں گا میں	اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

دوسرے الفاظ میں اکبر خدا کی گواہی اور وضع ملت ودین کے لئے شاعری کرتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ تما واعظ خشک اور بے مزہ ہوتا ہے اور رنج وغم کے عالم میں ہر وقت بسورتے رہنے سے چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور لوگ ہنسنے لگتے ہیں، اسلئے وہ لوگوں پر ہنستے ہیں ان کے خیالات ان کی بات چیت ان کے کھانے پینے تعلیم رہنے سہنے پر ہنستی اڑاتے ہیں، ان کے فقرے کچھ ایسے برجستہ اور چبھتے ہوئے ہوتے ہیں کہ جن پر ان کا وار سب سے زیادہ ہوتا ہے وہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے مگر ہنسی ہنسی میں اکبر اپنا کام نکال لیتے ہیں۔

تلوار چمکتی ہے تو لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، وار اپنا کام کر جاتا ہے ہمارے شعر وادب میں ظرافت اکبر سے پہلے بھی موجود تھی، سودا اور انشا غالب اودھ پنچ میں لکھنے والے ایسے نہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکے، سودا غیر معمولی

سوجھ بوجھ رکھتے تھے وہ جس پر توجہ کرتے تھے اس کا ایسا کارٹون بنانے کہ ہنستے ہی بنتی۔ انشاء سے بھی بڑے بذلہ سنج آدمی تھے۔ ان کی حاضر جوابی، ان کے لطیفے آج تک مشہور ہیں، مگر غالب سے پہلے ظرافت ذرا پست قسم کی تھی اس میں شخصی اور ذاتی کمزوریوں کا ذکر زیادہ تھا بجلی اور تلوار کی طرح یہ ہر طرف صفایا کر دیتی دل کے غنچے کھلانے کا کام اور لطف زندگی بلکہ نشاط زندگی بڑھانے کا کام اس سے نہ لیا گیا تھا۔ غالب نے اپنی خوش معنی آفرینی، لطافت سے کام لے کر زندگی کا لطف بڑھا دیا۔ مگر زندگی کے دھارے کو کسی طرف موڑنے کا کام ظرافت سے اکبر سے پہلے کسی نے نہ لیا تھا۔ خود اودھ پنچ میں لکھنے والے (جن میں اکبر بھی شروع شروع میں شامل تھے) نئی باتوں پر ہنستے تھے مگر ان کا قہقہہ بہت بلند اور بعض دفعہ مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اکبر نے ظرافت کے ذریعہ سے اس سیلاب کو روکنا چاہا جو ان کا سب کچھ بہائے لے جا رہا تھا اپنی اس کوشش میں انہیں کتنی کامیابی کی امید تھی یہ ان کے اشعار سے واضح ہوگا۔

شعر اکبر کو سمجھو لو یادگار انقلاب یہ اسے معلوم ہے ہنتی نہیں آئی ہوئی

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا !
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کرہی لیگا مرا ہوا کیا

ہمیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہو اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

نہ حالی کی مناجاتوں کی پرواز ملنے کی
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یار ان خود آرا

آثار کہہ رہے ہیں گوشہ دل حزیں میں
جینا رہا تو تو بھی مل جائے گا انہیں میں

لیکن اس کا مطلب نہیں کہ اکبر کی طنز و ظرافت بے کار گئی۔ دراصل اس کی وجہ مغربیت کے خلاف ردعمل شروع ہوا اور سرسید کی تعلیمی تحریک اور مغربی سیاست کے نتائج سمجھ میں آنے لگے، ہاں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر خود زمانے کے بہاؤ کو سمجھتے تھے وہ بہاؤ کو روک نہ سکے مگر آنے والی نسلوں کو ہوشیار کر سکے۔

اکبر کے یہاں طنز و ظرافت کا ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے وہ بہت بڑے ہتھوڑ ہیں۔ انہیں ہر واقعہ کا مضحک پہلو بہت جلد نظر آجاتا ہے عام خیالی کو الٹنے پلٹنے، پرانے اشعار کو نیا رنگ دینے خیال کی ترتیب بدل کر اسے کچھ کا کچھ کر دینے میں انہیں لطف آتا ہے وہ پہلے واعظ پر اس لئے ہنستے ہیں کہ اردو شاعری میں واعظ کی ہنسی اڑانا لازمی بات ہے، مگر جب انہوں نے اپنے تمدن پر گہری نظر ڈالی تو انہیں معلوم ہوا کہ مذہب کی روح کے بجائے اس کے الفاظ پر جان دینا اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنا منبر کی زندگی اور خلوت کی زندگی میں ایک فرق رکھنا خانقاہ پر دنیا کو اور عبادت پر خدمت کو قربان کر دینا مولویوں کا عام شیوہ ہے تو اکبر کی ہنسی میں ایک سنجیدہ مقصد بھی آگیا ؎

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے　　گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

اسی طرح لیڈروں کی قوم فروشی، نئی پود کی اپنی چیزوں سے بے نیازی اور بے پردگی وائسرائے کی مصلحتیں سیاست کے نئے جال اور اس کے شکاری مرزا کی کتاب ردی ہے اور بدھو صاحب کا حوالہ دے کر اکڑ رہے ہیں کونسل میں سینکڑوں سید جمع ہیں مگر مسجد میں فقط جمن ہیں۔ مغربی علم کے بجائے مغربی مس سے دلچسپی ہے خود گٹ پٹ پر جان دیتے ہیں، مگر لڑکیوں کو تاکید ہے کہ قرآن مجید پڑھیں۔ تعلیم کا مقصد علم سکھانا نہیں بلکہ سرکاری خوشنودی، اور اس مقصد کی

بجا آوری ہے۔ سید صاحب جب گزٹ لے کر اٹھتے ہیں تو لاکھوں لاتے ہیں شیخ قرآن دکھاتے پھرتے ہیں پیسہ نہیں ملتا۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی لغزشوں بے اعتدالیوں اور زیادتیوں پر اکبر کا دل کڑھتا ہے۔ مگر جانتے ہیں کہ رونے سے کام نہیں چلے گا۔ اور نصیحت پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ انہیں معلوم ہے کہ لوگ ضرب شدید گوارا کر لیتے ہیں، طنز کا ایک ہلکا سا نشتر برداشت نہیں کر سکتے اسلئے طنز کو ظرافت کا لباس دیتے ہیں۔

ان کا آرٹ مقصدی ہے، مگر اس کی چاشنی دلکشی اور کیفیت اس مقصد سے علیحدہ بھی ہے۔ ظرافت پیدا کرنے کے لئے بعض لوگ صرف الفاظ کے پھیر سے کا خیال بھی۔ اکبر کا آرٹ بھی بہت کچھ الفاظ کے الٹ پھیر کا ہے، مگر کبھی کبھی ان کا خیال بھی مضحکہ خیز ہوتا ہے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے انہوں نے بعض ایسے کام لئے ہیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں لئے۔ ع

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

دختر رز نے اٹھا رکھی ہے آفت سر پر — خیریت گزری کہ انگور کا بیٹا نہ ہوا

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے ایک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

مگر اکبر کے آرٹ میں سب سے بڑی جگہ ان کے قافیوں کی ہے، اکبر کو الفاظ پر غیر معمولی قدرت تھی۔ وہ ایسے ایسے قافیے ڈھونڈ کر لاتے تھے جن کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ شبلی کے لئے فعلہ شبلی کا استعمال صرف اکبر ہی کر سکتے تھے، انہوں نے صرف اردو کے الفاظ سے نہیں بلکہ انگریزی کے الفاظ سے بھی اپنے قافیوں میں مدد لی اور ان سے جو لطف پیدا کیا وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ چند قافیوں کی بہار دیکھئے۔ ع

بر علی مراد ہیں یا سکھ نداں ہیں — لیکن معائنہ کو وہی تا مداں ہیں

لمکی ترتیب وار ہیں دو لیکچر کا پڑے — بلیٹن نہیں تو خیر رسالے نکالیے

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے — لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

کیا خوشی اس کی مجھے ان کو جو نوابی ملی — غنی صاحب نے ملی مجھ کو وہی آبی ملی

اکبر کی کامیابی کا دوسرا راز ان کی چند اصطلاحوں میں ہے جن کی آڑ میں وہ بڑے بڑے مضامین بیان کر گئے ہیں۔ بدھو، کلو، وفاتی، جمن، شیخ مس پیر طریقت اکبر کے یہاں بار بار آتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اکبر نے بہت سے اشعار کہے ہیں چند مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

شان تمانہ اکبر شاہانہ ہو چلی ہے — مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

اولاد مرتد ہے طرح بدنام ہیں — نیاگ بدھو وارث اسلام ہیں

گرجا میں لاٹ صاحب منبر پہ شیخ صاحب — بدھو ملاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں

خاک اڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے

مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں!

انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی اکبر کے یہاں بہت آزادانہ ہے کہیں تو اس سے بڑا لطف پیدا ہو گیا اور کہیں یہ بد نما معلوم ہوتا ہے، دونوں کی مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

ایسی پری اور مجھ کو پیار لکھے — الفاظ میں دیکھئے ڈیر کلو ہے

ان کے دست ناز سے پائی ٹی — اب کہاں پانی مجھ میں پا کمیٹی

اس کے علاوہ اکبر کہیں مخالف کے دعوے کو تسلیم کر کے اس کے ایک ایسے پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ سارا دعویٰ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے کبھی پرانے شعراء کے اشعار میں اس طرح تصرف کرتے ہیں کہ مضمون نیا ہو جاتا ہے مگر ان کے آرٹ

کے سب سے اچھے نمونے پردہ اور مغربی تعلیم و اخلاق کے خلاف ملتے ہیں پردے کے
خلاف اکبر کے اشعار ضرب المثل ہوگئے ہیں اسلئے میں انکا دہرانا یہاں ضروری نہیں سمجھتا
لیکن جہاں انہوں نے مشرقی عورت اور مغربی عورت کا موازنہ کیا ہے وہ
پیش کرتا ہوں۔

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی — چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سلئے کی کیسی سن سن ہو مس انگریز ہے لیکن — لیکن شوخ کے گھنگھرو کی ادا اور ہی کچھ ہے

مغربی تعلیم سے اکبر بہت بیزار ہیں اور یہاں ان کی بیزاری بہت کچھ درست
دکھتی ہے در اصل یہ قدامت پرستوں ہی کی آواز نہیں ہندوستان کی روح بیان کی

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی — عہدوں سے آرہی ہے صدا دور دور کی
ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی
تہوار تھے مجھ کو بکس کی وہ گردشیں — خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے زینتیں
نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
بولے خود تو مست بادہ عشرت کے خم سے آپ — اچھا رہے ہیں مجھ کو سنا دوں کی دم ہے یہ

اشعار بہت ہوگئے مگر میرا خیال ہے کہ ان کے بغیر آپ اکبر کے خیالات تو جان لیتے
ان خیالات کی چاشنی، رنگینی اور لطف سے واقف نہ ہوتے یہ لطف انکے یہاں اس قدر
ہے کہ اسے موضوع سے بھی تعلق نہیں۔ آپ ان کے خیالات سے اتفاق نہ بھی کریں مگر
انکے خیالات و اشعار پر مسکرائے اور غور کئے بغیر نہیں رہ سکتے یہی انکا مقصد تھا۔

ان کی روایت اب تک زندہ ہے اور نظم میں ظفر علی خان اور ظریف لکھنوی
اور نثر میں رشید صدیقی ان کے رنگ میں چلنے والے ہیں مگر پھر بھی یہ کہئے کہ مولوی
مدن والی بات ابھی ان لوگوں میں کہاں۔

چکبست لکھنوی

اُردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغباں کی محنت کا ثمرہ نہیں
اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے اس کی تعمیر
میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت
کا ہاتھ رکھا ہے بادشاہوں نے اسے ہاتھ لگایا ہے۔ سپاہیوں نے زبان تیغ
اور تیغ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور
کا ادب ہے جمہور نے اسے گویائی بخشی اور جمہور نے اسے پروان چڑھایا۔

اُردو ادب کی تاریخ میں مسلمانوں کے دوش بدوش صدہا نامور
ہندوؤں کے ملے گئے جنہوں نے اپنی گرانقدر کوششوں سے ادب کے مختلف
اصناف کو مالا مال کیا اور ہمارا جدید ادب جو انیسویں صدی کے آخری
نصف کی پیداوار ہے اس زمرۂ خاص میں اور بھی ممتاز ہے۔

مگر ہندوؤں میں کشمیر کے پنڈت جو تاریخ ہند میں اپنی ذہانت اور طباعی
کیلئے مشہور ہیں۔ اُردو ادب کی خدمت کے لئے کم مشہور نہیں، یہ خادم نہیں
مخدوم ہیں۔ شعراء سخن کا بول بالا ان کے عہد حکومت میں عام تھا۔

ان بزرگوں میں بھی پایا جاتا تھا جب تک اُردو زبان عہد طفولیت میں تھی اور فارسی کا رنگ چھایا ہوا تھا اس قوم میں بھی فارسی کا مذاق رچا ہوا تھا مگر جب فارسی کا چراغ جھلملایا اور اُردو نے پر و بال نکالے تو ان حضرات نے اُردو کی طرف توجہ کی اس ممتاز فہرست میں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، ترکبھون ناتھ ہجر، بشن نرائن دَرد، برج نرائن چکبست اور منج بہادر پیرد جیسے ادیب (شاعر اور صاحب ذوق ملتے ہیں۔ آج کی صحبت میں چکبست کے کمالات پر ایک ... نظر ڈالنی ہے

چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا۔ اس لئے وہیں چلے آئے اور تعلیم وہیں حاصل کی شعر و ادب کا ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ اور لکھنوی مذاق رگ رگ میں رچا ہوا تھا ۱۹۰۵ء کیننگ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد آپ نے وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں آپ کو خاص کامیابی حاصل ہوئی ۱۹۲۶ء میں جب آپ کی عمر تقریباً ۴۵ سال تھی اچانک انتقال کیا اور کاظم حسین محشر نے آپ ہی کے مصرعے سے تاریخ نکالی

ان کے ہی مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہا تھا ایک طرف قدامت کا رنگ تھا جو ابھی سماج پر چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہی تھی، اس ماحول میں طبائع زیادہ منفعل اور معیار زیادہ سخت تھے کچھ لوگ قدامت پرست تھے کچھ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ایسے بھی تھے جو تھوڑی سی تبدیلی، تھوڑی سی رفوگری کے قائل تھے چکبست اس آخری طبقہ

سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال کی زبان میں ان کا قلب مومن اور دماغ کافر تھا۔
وہ لکھنؤ کی تہذیب، تمدن معاشرت اور اخلاق کے دلدادہ تھے، مگر اس کے
ساتھ زمانہ کا رخ دیکھ کر اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے
اصلاح و ترمیم کے بھی حامی تھے۔ ان کا اصول رہی بر انا خذ ما صفا و دع
ما کدر والا اصول تھا۔ اس اصول میں کوئی خرابی نہیں مگر مشکل یہ ہے
کہ اچھائی اور برائی کا معیار بھی انسان خود ہی متعین کر لیتا ہے وہ نہ صرف
ایک اچھے نقاد اور اچھے اہل قلم تھے بلکہ اچھے انسان بھی تھے وہ اس طبقہ
سے تعلق نہ رکھتے تھے جو صرف عزت و آرام کی زندگی گزارنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ
قوم کی بہبود اور بہتری کے لئے نہایت نیک خیالات بھی دل میں رکھتا ہے۔ یہ نیک
خیالات قدرتی طور پر معتدل اور صلح پسند خیالات ہوتے ہیں۔

چکبست جدید دور کے شعرا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں، ان کا مجموعہ
کلام "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ہمارے شعرا اپنے دواوین کے
تاریخی نام رکھنے میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ کلام کی خصوصیت سے اسے کوئی
علاقہ نہیں رہتا ایک صاحب اپنے دیوان کو بیاض فطرت کہتے ہیں، حالانکہ صحیح
نام اشیا سے دو دو باتیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس میں بسم اللہ سے تمت
تک اشیا ہی جلوہ گر ہیں خیر تو صبح وطن چکبست کے رجحان کا صحیح پتہ دیتی ہے کیونکہ
وطن کی محبت چکبست کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کتاب کے پہلے
حصہ میں جو نظمیں ہیں وہ تمام تر وطن اور حب وطن سے متعلق ہیں ان میں
سے بعض نظمیں سیدھی صاف اور سہل زبان میں لکھی گئی ہیں، نہایت پر اثر
ہیں اور کافی مشہور ہو چکی ہیں۔ ہمارا وطن دل سے پیارا، وطن را اور
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک، سے شاید ہی کوئی شخص ناآشنا ہو ایک دوسری

نظم "خاک ہند" میں ہندوستان کی قدیم عظمت اور اس کے مشاہیر کا ذکر کس محبت کرتے ہیں ؎

دیوار و در سے اب تک انکا اثر عیاں ہے | اپنی رگوں میں اب تک انکا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے | فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

قوم کی آزادی کے متعلق چکبست کا نظریہ ہمارے لبرل سیاست دانوں کے تصور سے ملتا جلتا ہے فرماتے ہیں۔ ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے | وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے | نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے

سر پر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ میں شرکت کے لئے جاتی ہے چکبست انہیں یوں بڑھاوا دیتے ہیں اخدا ایسی وہ تدبیر کی تربیت کو عزت کرے ان کے بعد بھی انکو رنگ کے عالم لیوا باقی رہے؛

ساحل ہند سے جو بار وطن جاتے ہیں | کیا نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں | تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

"صبح وطن" کے دوسرے حصے میں زیادہ تر اصلاحی اور مذہبی نظمیں ہیں اس میں بھی زیادہ تر مرثیے لکھے گئے ہیں جو چکبست کے اس صنف میں

خاص کامیابی سے نباہا ہے، ایک جگہ نوجوان سے خطاب ہوتا ہے۔

چمن عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب — خم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
زینۂ علم پہ ہر وقت رہو گرمِ شتاب — شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیبِ شباب
لے اڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

"گائے" پر ایک اچھی نظم لکھی ہے، اپنی عقیدت کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ "دودھ سے تیرے لڑکپن میں نہ پالی دلدی ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے ع

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں — چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں — ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیر لیا — آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

سب سے دلچسپ نظم "لڑکیوں سے خطاب" لکھی ہے چکبست عورتوں کی آزادی کے بارے میں "حد ادب" کے قائل تھے بچپن میں جو کہانیاں سنتے تھے ان سب میں ایک چیز مشترک ہوتی تھی ہیرو کو اس کی بہن یا بیوی یا ماں تین طرف جانے کی اجازت دیتی تھی اور چوتھی طرف کے لئے منع کرتی تھی نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا تھا۔ ہر شخص ہمیشہ چوتھی سمت کو دوڑتا تھا، کہیں ہماری لڑکیوں اور عورتوں کا بھی حشر نہ ہو بہر حال نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ع

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
دل تمہارا ہے دعاؤں کی پرستش کیلئے — اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز
اپنے بچوں کو خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں   یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز

کسی زبان کی شاعری صرف عنایت رنگینیوں اور غزلوں سے مالامال نہیں ہوتی اس میں قدیم مذہبی اور نیم مذہبی داستانوں کی بھی ضرورت ہے بڑے افسوس کی بات ہے کہ رامائن اور مہابھارت کی داستانیں ابھی اردو میں صرف تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ چکبست نے رامائن کا ایک سین کھینچا ہے جس کو پڑھ کر ان کی اس صنف میں قادر الکلامی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کام کے لئے نہایت موزوں تھے ماں کے دل کا اضطراب اور رامچندر جی کے بن باس پر پریشانی کا حال یوں بیان ہوتا ہے۔

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر   گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر   یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

رام چندر جی کا جواب بھی ان کی بلند سیرت اور توکل کے شایان شان ہے

اپنی نگاہ بھی ہے کسی کارساز پر   صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر   رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

تیسرے حصے میں بیشتر مراثی ہیں۔ یہ مرثیے صرف غم کی داستانیں نہیں ہیں ان میں چکبست نے سیرت نگاری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے ہیں کو کھلے اور نمک کے گرد صرف آنسوؤں کا سیلاب ہی نہیں یہ زندہ اور تابندہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ نظمیں صرف وقتی نہیں رہتیں بلکہ لازوال ہو جاتی ہیں۔ ایک

کہ بتمائے قوم کے ملاحظہ میں لکھتے ہیں۔ ؎

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ — سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسنِ انتخاب کے ساتھ — شباب قوم چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

چکبست کی غزلوں میں بھی ان کا پیامی رنگ جھلکتا ہے۔ بعض تنگ نظر لگوں نے انہیں غزل کی حدود سے خارج کر دیں۔ انہیں مشکل سے کوئی شعر معاملہ بندی اور زلف گرہ گیر کی مدح میں ملے گا۔ ہاں "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" قسم کے بہت سے شعر نظر آئیں گے ؎

فنا نہیں ہے محبت کی رنگ و بو کے لئے — بہار عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے
جنون حب وطن کا مزہ شباب میں ہے — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جنون لگتا ہے ابھی مانگ لو وطن کیلئے — یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے
مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے — بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے
ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے — ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
نفاق گبر و مسلمان کا یوں مٹا آخر — یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے
فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا — اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا
وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر گیا رہوا — جسے ہم نے نمک پروردۂ زخم جگر جانا
نہ کوئی دوست دشمن ہو شریک درد و غم میرا — سلامت میری گردن پر رہے بار الم میرا
لکھا یہ داور محشر نے میری فرد عصیاں پر — یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

(اس شعر کی داد دینے کے لئے اقبال کا اسی مضمون کا شعر سنئے)

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اور اصغر بھی اس میدان میں پیچھے نہیں ؎

سنا ہے حشر میں شان کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاع ذوق عصیاں کے

جس کی نفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کیلئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

ہو گیا ہوں ساری دنیا کے گناہوں میں شریک
جب سے میں نے سنا ہے اس کی رحمت عام ہے

ہمارے اساتذہ میں کلام کی خوبی کا معیار مشق کی کثرت اور سلسلہ کی عظمت تھا چنانچہ ایک صاحب کا یہ شعر آپ نے سنا ہوگا ؎

شاعری کھیل نہیں ہے جسے لڑکا کھیلے!
ہم نے پچپن برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

غریب چکبست اس معیار کے مطابق شاید شیر خوار ہی ٹھہرے وہ جوانی ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس سے زیادہ تر اپنی طبع رسا کو رہبر بنایا وہ بقول خود تخلص کا بھی دنیا میں گنہ گار نہ تھا اس میں شاعری کا فطری ذوق تھا ایک حساس طبیعت تھی اور اس کے انداز بیان میں ایک رعنائی اور رنگینی تھی ہمارا جدید اردو ادب اسی رنگینی سے باغ بہار بنا ہوا ہے۔

چکبست کی شاعری کئی پہلوؤں سے جدید شاعری ہے اس میں اچھے تجربے بھی ہیں اور یہ تجربے موضوع اور اسلوب دونوں کے ہیں مگر زیادہ تر چکبست کا اسلوب قدیم رنگ کی ایک نکھری ہوئی شکل ہے، چکبست کے معیار میں وطن قدر اعلیٰ تھا، اور خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا، وطن کی یہ محبت محض اس کے خوبصورت مناظر تک محدود نہ تھی (چکبست مناظر فطرت کے شیدائی ضرور

ہیں مگر اوپری دل سے۔ انہیں انسانوں کی نقل میں زیادہ عطا ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈہرہ دون سے آگے نہیں بڑھے اور یہیں سے بہت جاہلہ معرفت گرد گار کے مظاہرے دیکھنے لگے۔ ہاں تو وطن کی محض محبت اس کے منازل کی وجہ سے نہیں۔ اس کی مخصوص ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کی وجہ سے ہے جس کی تعریف بقول ایک بزرگ ویدک دھرم اور خلافت راشدہ دونوں نے حصہ لیا ہے۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد جنگ عظیم سے قبل ہو رہی تھی۔ اس میں چکبست دل و جان سے شریک تھے۔ مگر وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جسے آج ہم لبرل اور ماڈریٹ کہتے ہیں۔

چکبست انیس و آتش کے صرف قائل ہی نہیں مقلد بھی تھے ان کی نظموں اور غزلوں میں ہر دو اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں رنگینی و درد ہے، صدق جذبات اور سوز و گداز نے کلام میں تاثیر پیدا کی ہے اور روانی و صفائی نے اسے دلنشین بنایا ہے۔ اس میں گہرائی ضرور کم ہے اور چونکہ وقتی مسائل سے زیادہ بحث ہے۔ اس لئے اس کی ابدیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔

چکبست کے مضامین کا ایک مجموعہ مضامین چکبست کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں زیادہ تر ادبی مقالات ہیں۔ اور ان میں سے بعض مثلاً دیباچہ گلزار نسیم، داغ، اودھ پنچ، رتن ناتھ سرشار مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔

سرسید اور ان کے رفقاء نے جہاں جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی وہاں تنقید میں بھی نئی راہیں نکالیں ان سے پہلے ہماری تنقید کا معیار شخصی اور صنعتی تھا شاعر کو اپنے ماحول سے بیگانہ عالم بالا میں پرواز کرتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور اس کے کلام کی اچھائی یا برائی اساتذہ کے استاد سے تعین کی جاتی تھی ان بزرگوں نے تنقید کا دوسرا رنگ نکالا جس میں شاعر کے خیالات ماخذ اس کے ماحول

میں تلاش کیا جاتا ہے، اس کی سیرت کو پرکھا جاتا ہے اور کلام سے مطابقت کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے خیالات کی بلندی اور گہرائی پر نظر ڈالی جاتی ہے پھر کہیں ان کا درجہ متعین کیا جاتا ہے، چکبست اس میدان قدامت پسند کی حیثیت سے رونق افروز ہیں۔ ان کا لکھنوی مذاق انہیں منطقی اور شخصی معیار سے نکلنے نہیں دیتا مگر وہ صرف اس پر قناعت نہیں کرتے غیر معمولے قدرت، اردو اور فارسی کے فاضل تھے اور اپنی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت تھی، اس لئے ان کے طرز تحریر میں ایک خاص شستگی اور روانی ہوتی ہے اور وہ محض تنقیص پر قناعت نہیں کرتے، مثلاً داغ پر ان کا مضمون بہت دنوں تک دوسرے نقادوں کا مشعلِ راہ بنا رہا اگرچہ وہ اپنے تندرست جاندار اور تھوڑے سے محدود تصور کی وجہ سے بعض بڑی قطعی باتیں کہہ دیتے تھے وہ بالکل غیر جانبدار کبھی نہ رہ سکتے تھے، مگر اکثر کام کی باتیں اور اچھی باتیں بتا سکتے تھے۔ ان کی رائے کے ماننے پر ہم مجبور نہیں مگر اس کی عزت کرنے پر ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ وہ نسل جس سے چکبست تعلق رکھتے تھے شمالی ہند سے اٹھتی جاتی ہے اور اب اس کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے یہ وہ نسل تھی جو اپنی تہذیب و معاشرت اور اردو ادب سے قلبی محبت رکھتے ہوئے ترقی پسند اور آزاد خیال بھی تھی، آپ حضرات اس کے یہ معنی نہ سمجھیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہ لوگ قدیم اور جدید سلسلے کی درمیانی کڑی تھے اور دونوں کو ایک دوسرے قریب کرتے تھے۔ بہت زیادہ سوچ نہ سکتے تھے بہت اونچا اڑ نہ سکتے تھے، بہت دور دیکھنا ان کے بس کا نہ تھا کیونکہ

تاریکی سے ابھی ابھی نکلے تھے۔ مگر ان کا دل فراخ ان کی طبیعت زیادہ سلجھی ہوئی اور ان محبت کے زاویئے زیادہ وسیع تھے۔ اور بعض لوگ جب ان کی نارسائی پر اعتراض کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ کیسی کیسی مشکلات انہیں دامن گیر تھیں۔ (۱۹۳۶ء)



اقبال اور ان کا فلسفہ

اقبال کو ہم سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت گذر گئی اس عرصہ میں ان کی یادگاریں سینکڑوں جلسے کئے گئے ہزاروں تقریریں ہوئیں نظمیں پڑھی گئیں۔ اخباروں میں مضامین نکلے، رسالوں نے خاص نمبر شائع کئے، کئی مستقل کتابیں ان کی شاعری یا پیغام کی تشریح کیلئے لکھی گئیں۔ غرض ملک کے اس سرے سے اس سرے تک ہر ایک نے بہت بڑے شاعر، فلسفی مصلح، رہبر، مفکر حکیم اور انسان کا ماتم کیا، موت نے انہیں ہم سے جدا کرنا چاہا مگر وہ مر کر ہم سے اور قریب ہو گئے۔ انہیں حیات ابدی مل گئی۔ ان کی شخصیت دھندلی ہونے کے بجائے اور واضح ہو گئی ان کی شاعری مرجانے کی بجائے اور زندہ ہو گئی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اقبال کی عظمت کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟

ایک عامی سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اقبال بہت بڑے شاعر تھے، انہوں نے ترانہ لکھا ہے جسے سن کر ہمارے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے، ایک بلند پایہ نقاد کہے گا کہ اقبال نے "اردو شاعری کو ایک فلسفیانہ ہم آہنگی عطا کی ہے

پھر نوجوانوں کے لئے ان کے یہاں ایک درسِ عمل ایک پیغام ملتا ہے ماضی کی یاد اور مستقبل کا تصور ہے، زندگی کا احساس اور عمل کا جوش ہے اقبال خیالات کو بلند ہمتوں کو مضبوط، نظر کو وسیع کرتا ہے، اس کی شاعری "چیزے دگر" بھی ہے اور "جزویست از پیغمبری" بھی وہ گریہ ابرِ بہار اور "خندہ تیغِ اصل" دونوں سے کام لیتا ہے، حالی اور اکبر دونوں کے سلسلے کی کڑی اسی پر ختم ہوتی ہے۔

یہ کہنا کہ اقبال ایک فلسفی ہے اقبال کی بہت بڑی توہین ہے، فلسفی حقیقت کی خشک اور بے جان تفسیریں کرتا ہے۔ وہ کائنات کا ادراک صرف اپنے ذہن سے کرنا چاہتا ہے وہ مادہ اور روح کی بحث میں الجھتا رہتا ہے۔ وہ تامی نہیں جانا ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام سرچشموں میں صرف عقل سے دلچسپی دیکھتا ہے اسلئے عقلی استدلال پر جان دیتا ہے وہ شاہیں نہیں کرگس ہے شکار زندہ کی لذت اسے نصیب نہیں وہ الفاظ کے پیچوں میں الجھتا رہتا ہے وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ بات میں منطقی پہلو سے کہیں کوئی تناقض تو نہیں ہے اسے کیا معلوم کہ اس تناقض کی رنگینی سے زندگی کی آب و تاب قائم ہے اس لئے اقبال کو ہم اس معنی میں فلسفی نہیں کہہ سکتے۔ ان کا فلسفہ وہ ہے جو خون جگر سے لکھا جائے وہ "مستی احوال" یا "مستی گفتار" کے قائل نہیں "مستی کردار" پہ جان دیتے ہیں۔ ان کا اپنا فلسفہ حیات ہے یہ فلسفہ حیات نہ تو فقیر کی جھولی کی طرح ہے جس میں ادھر ادھر سے مانگ کر بھیک کے ٹکڑے جمع کئے گئے ہوں، نہ یہ خود رو ہے بلکہ اس میں ہمارے تمام سرمایہ ذہنی کی ترقی یافتہ شکل ملتی ہے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے حکماء اور مفکروں کے خیالات کے ساتھ پرواز کی ہے ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور نظر نہایت گہری ہے۔ وہ خدا جانے کہاں کہاں سے غواصی کر کے موتی لائے ہیں

مگر ان موتیوں کو ایک نئے انداز سے پرو دیا ہے بہت سے خیالات جو پہلے دھندلے اور مبہم طور پر بیان ہوئے تھے اقبال کی فکر کی روشنی کے زیر اثر شعاعیں دینے لگتے ہیں یوں تو اقبال نے مشرق و مغرب کی ساری تہذیبی تمدنی میراث سے فائدہ اٹھایا ہے مگر خاص طور پر وہ رومی نیٹشے اور برگسان سے متاثر ہوئے ہیں ان کے علاوہ دوسرے مفکروں کے خیالات کا عکس بھی ملتا ہے مگر ان تینوں کا اثر زیادہ ہے جمال الدین افغانی۔ مجدد الف ثانی اور بیدل و غالب کا اثر بھی اقبال نے قبول کیا ہے۔

اقبال نے جب آنکھ کھولی تو ایک ایسا ماحول دیکھا جس میں بجائے زندگی کو "ہاں" کہنے کے "نہیں" پر زور دیا جاتا تھا یہ ماحول کچھ صوفیوں کی تعلیم کا نتیجہ تھا کچھ فلسفہ مسیحیت اور ویدانت کا انسان کی کوئی ہستی نہیں وہ فطرت کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے "عالم تمام حلقہ دام خیال ہے" یہ ساری نفی خودی کی تھی۔ عشرت قطرت ہے دریا میں فنا ہو جانا اور اس لئے آدمی کو چاہئے کہ اپنے آپ کو جمال یار کے مشاہدے میں گم کر دے فرد کی کوئی ہستی نہیں فرد کو چاہئے کہ اپنی انفرادی امتیازی خصوصیات کو مٹا دے۔

اس تعلیم کے نتائج سے اقبال بیزار تھے انہوں نے افلاطون کو "گوسفند از گوسفندان قدیم" اس وجہ سے کہا کہ یہ سارا فساد اس کی تعلیم کا ہے حافظ کو اس گروہ میں اس وجہ سے شامل کیا کہ ان کی تعلیم سے بھی نفی خودی کی تلقین ہوتی ہے صوفیوں کے خلاف اسی وجہ سے آواز اٹھائی کہ وہ دنیا سے الگ ہو کر مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید "کی تعلیم دیتے تھے شعرا کو اس لئے آگاہ کیا کہ ان کی "نوہ مردہ و افسردہ بے ذوق تھی"، رومی کی تعریف اس لئے کہ وہ بجائے عقل کے عشق پر ایمان رکھتا ہے، اثبات خودی کا بہت بڑا حامی ہے

نیٹشے کے قالب کو اسی وجہ سے مومن بنایا کہ وہ تعمیر خودی اور طاقت و کشمکش کا قائل ہے اقبال نہ صرف نیٹشے کا شاگرد رہا ہے نہ صرف رومی کا وہ نہ صرف مسولینی کا مداح ہے نہ صرف لینن کا وہ جہاں اور جس جگہ اپنے نقطہ نظر کی تائید دیکھتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے اور بڑی سے بڑی جگہ پر بھی اگر اسے اپنے پسند کی کوئی چیز نہیں ملتی تو وہاں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے گرد و پیش جو ماحول دیکھتا ہے اس سے اسے تکلیف ہوتی ہے اس لئے وہ نفی خودی کے بجائے اثبات خودی کا درس دیتا ہے خودی کو وہ بڑی سمجھت سے نکال کر اسے ایک بلند درجہ عطا کرتا ہے اور بجائے غرور و خود پسندی کے اس سے احساس نفس یا تعین ذات مراد لیتا ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرنا چاہئے خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرتا رہے اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرے اس طرح اس کی ذہنی قوتیں تیز ہوتی رہتی ہیں اس کی خودی بڑھتی جاتی ہے اس راہ میں ایک راہنمائی ضرورت ہے مگر یہ صرف عقل کے بس کی بات نہیں یہاں عشق سے مدد لی جا سکتی ہے عشق کی نہیں۔ اقبال کے یہاں وہ روحانی کیفیت ہے جو وجدان سے تعلق رکھتی ہے خودی عشق و محبت اور فقر و استغناء سے مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں۔

مگر خودی سے تعمیر و تخریب دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ شیطان تخریب خودی کی مثال ہے خودی کی تعمیر کے لئے اطاعت ضبط نفس اور نیابت الٰہی کے درجے ہیں۔ نیابت الٰہی کے درجے تک پہنچنا ہی انسانیت کا نصب العین ہے یہاں تک انسان محض اپنی عقل کے زور سے نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن عشق اسے یہاں تک لا سکتا ہے۔ ے انسانی زندگی کا نقطہ آغاز اپنی زندگی کا شعور ہے اور اس کی غزل مقصود یہ ہے کہ

مگر وہی عشق جس میں جذبۂ تسخیر و جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا تینوں پائے جاتے
ہوں جذبۂ تسخیر میں حرکت عمل اور پیکار کی ضرورت ہے۔ اقبال کے فلسفۂ حیات
کی اساس حرکت پر ہے اسے جمود سے نفرت ہے حرکت سے عمل اور پیکار کا جذبہ
بیدار ہوتا ہے اسی لئے سخت کوشش کرنے اور سرگرم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے
شباب اقبال کے نزدیک تن آسانی اور تن پروری نہیں اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا
دوسرا نام ہے کبوتر پر جھپٹنے میں جو مزا ہے وہ کبوتر کے لہو میں ہرگز نہیں اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خونریزی نہیں چاہتے صرف ان مردہ دلوں کو درس زندگی
دینا چاہتے ہیں جن کے قویٰ عمل شل ہو گئے ہیں، انہوں نے جہاں جہاں شاہین کا
ذکر کیا ہے وہاں شاہین کی خونریزی نہیں بلکہ اس کی غیرت اور اس کی نظر کی
تیزی اس کی بلند پروازی اس کے آشیاں نہ بنانے کی تعریف ہے وہ کبوتر کے
تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ جلد تنگ سے گھبرا چکے ہیں۔
اس لیے کہ فطرت کبوتر نگسار ہے مگر جنگ یا خونریزی انہیں پسند نہیں وہ
اسپاہ ثنا کے سپاہی نہیں چاہتے جو کبھی میدان جنگ سمجھتے ہیں یا وہ مصارف
زندگی میں سیرت فولاد اور شبستان زندگی میں حریر و پرنیاں پسند کرتے ہیں
وہ بیابان میں تندرو چشموں کا جوش و خروش اور دامن گلستان میں دھیمی
دھیمی بہنے والی جوئے دلنشیں کا نغمہ انہیں بھاتا ہے حلقۂ یاراں میں ریشم کی نرمی اور
رزم حق و باطل میں فولاد کی سختی انہیں عزیز ہے، ان کے مرد مومن کی پہچان
یہی ہے کہ جنگ میں وہ شیران غالب سے بڑھ کر ہے اور صلح میں رکھنے غزال تاتاری
کی مانند وہ خاکی ہے مگر خاک سے پیوند نہیں رکھتا، وہ آفاق میں اس میں گم ہے
وہ دنیا کے لئے نہیں دنیا اس کے لئے ہے۔

مگر فرد کی خودی اقبال کے یہاں مقصود بالذات نہیں ہے۔ اقبال اس

خودی سے بیخودی تک سب پہنچے ہیں فرد کی صلاحیت اس کی انفرادیت اس کی امتیازی خصوصیت جماعت کے مفاد کے لئے صرف ہونی چاہیے پرانے شعراء کہتے تھے کہ قطرہ دریا میں ملتا ہے تو اس کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ جماعت یا ملت کی صلاحیت کو بہتر بنانا یہ اقبال کا نصب العین ہے۔

دوسرے الفاظ میں اقبال تمام انسانوں کو دعوت عمل دیتے ہیں وہ کسی ایک فرقہ یا ملت کے شاعر نہیں تمام انسانیت کے شاعر ہیں وہ فرد کی خودی کی تکمیل اس لئے چاہتے ہیں کہ جماعت کا فائدہ ہو اور بحیثیت مجموعی جماعت ارتقاء کے میدان میں آگے قدم بڑھائے۔ انسانیت کی تکمیل کے لئے تکمیل خودی سب سے ضروری چیز ہے مشرق نے اسے بھلا دیا اور منفی اثرات میں مبتلا ہو گیا، مغرب نے خودی کی تکمیل کی مگر یہ تکمیل قوانین الہی کی پابند نہیں تھی۔ اور اس میں وہ روحانی جذبہ نہیں تھا جو اقبال کے نزدیک ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے نظام میں انتشار اور سراسیمگی کے عناصر نمایاں ہو رہے ہیں۔

انسانیت کی ترقی عین منشائے الہی ہے اس منشائے الہی تک پہنچنے کے لئے اس روحانی نظام کو اختیار کرنا ضروری ہے جو عین فطرت ہے اس روحانی نظام کی بنیاد توحید پر قائم ہے اور یہی مختلف ملکوں کے رہنے والوں کو ایک رشتے میں پروتی ہے توحید کے علاوہ اس نظام کی امتیازی خصوصیات اخوت مساوات اور وطن و رنگ و نسل کے محدود تصورات سے بلندی ہیں، وطن رنگ اور نسل کے امتیازات انسانیت کے ارتقا میں خلل انداز ہوتے ہیں یہ دراصل وقت کی چیز ہو گئے ہیں اور ان کی آڑ میں جو ظلم غریبوں اور کمزوروں پر کئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں محدود وطنیت اور رنگ و نسل کے فریب سے بچے ہوتے اس وقت جرمنی اور اٹلی میں پر کئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، محدود وطنیت اور

رنگ و نسل کے فریب کے سب سے اچھے نمونے اس وقت جرمنی اور اٹلی میں ہیں جہاں تہذیب کی مشعل لے کر دور حاضر کے بیڑے بین الاقوامی قانون توڑ کر بھلے مانسوں کی زندگی کو عذاب بنانے ہیں ان دونوں ملکوں میں وطن اور رنگ و نسل کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے اقبال کے نظریہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔

مگر اقبال وطن کے مسائل سے دلچسپی رکھتے اور آزادی پر جان دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ غلامی انسان کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے۔ [illegible] زندگی وسیع اور تیز دھارا۔ ایک تنگ اور گندا نالا بن جاتا ہے اور یا یہ صرف مردان حر کی آنکھیں بینا کہی جا سکتی ہیں اور آزادی سے محروم ہونا گویا انسانیت سے محروم ہونا ہے بال جبریل میں شاہی مزار پر نظم اور ضرب کلیم میں شعاع امید پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اقبال کے فلسفہ حیات میں آزادی کو بنیادی درجہ حاصل ہے اور وہ غلامی پر کسی حال میں راضی نہیں ہیں۔

اقبال تمام انسانوں کی آزادی کے ساتھ ان کی مساوات پر بھی زور دیتے ہیں اس لئے کہ بغیر مساوات کے آزادی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام کوششوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں جو انسان کو طبقوں میں بانٹنے کے لئے کی گئی ہیں اور ان کے اثر سے ایک آدمی دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اور دنیا کو دوزخ کا نمونہ بنا دیتا ہے۔ دولت کی غلط تقسیم دنیا میں بہت خرابیوں کی ذمہ دار ہے۔

اقبال جس دنیا کا قیام چاہتے ہیں۔ وہاں دست و دولت آفریں یعنی مزدور کو محض خیرات نہیں بلکہ اس کا حق ملے گا۔ وہ مزدوروں کی حکومت دنیا چاہتے ہیں اور مزدوروں کے دور کے آغاز کا پیام سناتے ہیں۔ ان کے خدا کا فرمان یہ ہے کہ جس کھیت کے دہقان کو روزی نہ ملے اس کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دینا چاہئے وہ لینن کی زبان سے خدا کو پوچھتے ہیں کہ سرمایہ پرستی کا سفینہ کب

ڈوبے گا۔ مگر وہ مزدوروں کی حکومت کے نام سے عوام پر استبداد کو گوارا نہیں کر سکتے جیسا کہ شروع میں روس میں ہوا ہے۔ وہ مزدوروں کو بھی یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ ظالم بن جائیں اور اپنے انتقام کی آگ میں ساری دنیا کو تباہ و برباد کر دیں۔ دنیا میں سوشلزم اور فاشزم کی جو کشمکش ہے، اقبال اس میں سوشلزم کو بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے خیال میں یہ اسلام سے زیادہ قریب ہے ارمغان حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ پڑھیے تو اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہاں وہ مارکس کو کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کے نام سے یاد کرتے ہیں جو پیغمبر نہیں مگر بغل میں کتاب رکھتا ہے۔

اقبال چونکہ زندگی میں حرکت عمل اور ارتقا چاہتے ہیں اس لئے نفی خودی کے اس درجہ مخالف ہیں کہ اگر انہیں اثبات خودی میں کہیں بھی غلو ملتا ہے تو وہ اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہتے چنانچہ ان کی مختلف نظموں میں ابلیس کی جرات وہمت استقلال اس کی دلچسپ شخصیت کی تعریف کی گئی ہے، یہ تعریف کچھ اس انداز میں ہے جو ملٹن نے فردوس گم شدہ میں استعمال کیا ہے اسی نقطۂ نظر سے اقبال کے لئے تعریف کرتے ہیں جو ارتقائے حیات علوئے آدم اور تسخیر فطرت کا ساتھی اور مسیحی تعلیم کے منفی اثرات کا شدت سے منکر ہے۔ اقبال اسے عزل کے بجائے مجذوب کہتے ہیں اور اس کے قلب کو مومن اور دماغ کو کافر جانتے ہیں اقبال کے نزدیک یہ کفر اس ایمان سے بہتر ہے جس کا اثر جمود اور ہو اس لئے کہ جذبۂ زندگی موجود رہے جو ممکن ہے آگے چل کر حرارت ایمانی نے منتقل ہو جاتے غرض اقبال کا فلسفہ زندگی پسندترین مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ زندگی کو فطرت کا مقصد و منشا سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں یقین ہے کہ زندگی موت کے ہاتھوں پامال نہیں ہو سکتی، چنانچہ والدہ مرحومہ کی یاد میں انہوں نے فلسفہ موت کو بڑے

بڑے دل کش انداز سے پیش کیا ہے ان کی نظم اسی وجہ سے انگریزی کے مشہور شعروں کے پایہ کی ہو گئی ہے۔ ان کے خیال میں موت کے ذریعہ فطرت زندگی کے مذاق کی تجدید کرتی ہے، وہ شدید آرزو ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے میں مصروف ہے اس دعوی کو انہوں نے موج مضطر، تخم گل اور ستاروں کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے بس نظم میں تخیل کی بلندی، خیالات کی پختگی، اور انداز بیان کی دلآویزی اس طرح مل گئی ہیں کہ نظم خاصے کی چیز ہو گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس مختصر مضمون میں شاید اقبال کے فلسفہ حیات کے بنیادی پہلو آپ کے سامنے آ گئے ہوں گے دنیا میں کم شاعر ایسے ہوں گے جو ایک ہی بات کو یا اس کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پھیر کر اس قدر دلچسپ بیان کر سکے ہوں باوجود اس کے اقبال کے یہاں حیرت انگیز تنوع ہے ان کے یہاں حیرت انگیز وحدت بھی ہے اس کا مکمل فلسفہ حیات ایک آہنگ اور ایک پیغام ہے اس فلسفہ حیات کیلئے وہ دوسروں کے ممنون بھی ہیں مگر کسی کے مقلد نہیں وہ بہت بڑے اخلاق بہت بڑے معلم بہت بڑے مفکر اور مجدد ہیں انہوں نے کیا قضا پائی اور کیا چھوڑی، اس پر غور کیجئے تو ان کی شاعری کی انقلابی خصوصیات آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔ وہ آب و رنگ شاعری کچھ نہیں سمجھتے اسی آب و رنگ شاعری کی وجہ سے ان کا فلسفہ حیات اس قدر حسین معلوم ہوتا ہے میں نے اقبال ایک بھی شعر ابھی نہیں لکھا لیکن اب ان کے چند شعر اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں پیش کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی — خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

پُرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

(۱۹۳۹ء)



شوکت علی خاں فانی

اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
لے زلفِ سیاہ فانی میں بکھر جا

یہ پرستارِ شبِ ہجر یہ شہیدِ ستم، یہ دلِ سوگوار یا سیاست کا یہ امام ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو اس دنیا سے رخصت ہوا۔ خود اپنے الفاظ میں:

اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

وطن بدایوں تھا مگر حیدر آباد میں بھی، ساز گار نہ وطن کی ہوا ہوئی نہ پردیس کی یہ احساس ہر وقت رہا۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن !
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شوکت علی خاں فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہ عالم کے زمانے میں کابل سے آئے تھے، دہلی والوں نے بہت (زمانہ) ان کے پردادا نواب بشارت خاں صوبہ بدایوں کے گورنر تھے مگر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے والد شجاعت خاں پولیس کی معمولی ملازمت پر مجبور ہو گئے تھے۔ فانی نے آنکھ کھولی تو جو کچھ رہا سہا تھا جا رہا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے بی اے

اور ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی علی گڑھ سے کیا۔ وکالت ایک عمر تک کی مگر کامیابی
کبھی نہ ہوئی جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فانی نالائق تھے بلکہ وہ اس پیشے سے نفرت
کرتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا بڑے جبر کے بعد وہ موکلوں کی طرف متوجہ ہوتے مگر
کوئی ملنے والا آگیا تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر شعر و شاعری کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ
بریلی، بدایوں اور آگرہ میں عرصہ تک برائے نام وکالت کی در اصل وہاں کے
مشاعروں اور ادبی صحبتوں کے روح رواں بنے رہے ان کی ابتدائی شاعری میں
لکھنؤ کا اثر اس وجہ سے نمایاں ہے کہ جب انہیں شعر کہنا آیا تو لکھنؤ میں تھے اس
ماحول سے کیسے متاثر نہ ہوتے۔ میں نے انہیں اپنے زمانہ طالب علمی میں آگرہ میں
اکثر دیکھا ہے۔ وہ اس زمانہ میں عام مشاعروں میں کم جاتے تھے طالب علموں کی دعوت
رد کرتے تھے۔ دیوان فانی ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا۔ باقیات ۱۹۲۶ء میں نکلی
باقیات کی اشاعت کے بعد سے فانی دور حاضر کے ممتاز شاعروں میں سمجھے جاتے تھے
فانی کا کلام لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کے کمال کا اعتراف مذاق سلیم کی پہچان تصور کیا تھا۔
دہلی اور لکھنؤ کے بیچ میں جو علاقہ ہے اس میں میراثنیں اکثر گھروں میں تقریبوں کے
موقع پر گیت گاتی ہیں ان گیتوں کے ساتھ فانی کی غزل حال دل سوز غم ہائے نہانی
دیکھتے جاؤ میں نے اکثر سنی ہے۔ جس مشاعرہ میں فانی ہوتے لوگ ان کا کلام سننے
کے بڑے مشتاق نظر آتے۔ فانی کا وجود بڑے بڑے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت
تھا۔ ان کی آواز بہت اونچی نہ تھی اس لئے وہ بہت دور تک سنائی نہ دیتی تھی
میں نے اکثر دیکھا ہے کہ فانی نے کوئی شعر پڑھا جو آگے بیٹھے تھے انہوں نے تو
سن لیا مگر پیچھے کے لوگ نہ سن سکے۔ اس پر ایک ہنگامہ شروع ہوا۔ مگر دوسرا شعر
پڑھتے ہی مکمل خاموشی چھا جاتی۔ یہ اپنی پرسوز دھیمی، مگر بلا کی پرکیف آواز
میں جھوم جھوم کر پڑھتے تو تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوتا کہ کائنات پر ایک

درد سا طاری ہو گیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ان کی غزل کا مجھے ایک شعر نہیں بھولتا۔ ؎

وہاں سجدے بے آہنگ قدسیوں کے سر نہیں اٹھتے
پڑا اٹھا جس جگہ راہ محبت میں نام میرا

فانی کے گھر پر شاعروں اور شعر سننے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا صاحب ذوق لوگوں کے سامنے شعر سننے یا سنانے میں انہیں بہت کم تکلف ہوتا تھا ہر کس و ناکس کو شعر نہ سناتے تھے میر کی طرح دوسروں کے کم کمال کا اعتراف گناہ نہ سمجھتے تھے اپنے معاصرین میں بعض کے بڑے مداح تھے۔ ایک دفعہ اپنی مشہور غزل ہستی کی کیا ہستی ہے "پڑھ رہے تھے جب اس شعر پر پہنچے تو بہت تعریف ہوئی۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

کہنے لگے کہ میں نے کیا پاس (بیگانہ) نے یہ قافیہ نظم کیا ہے

جنتو جس سے ملتا ہے کچھ سراغ یا طن کا
چال پر تو ظالم کے سادگی برستی ہے

جگر کے بعض اشعار کے بڑے مداح تھے خصوصاً اس شعر کے جو دراصل ان کے رنگ میں ہے۔ ؎

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخل آداب زنداں ہو گیا

آگرہ میں فانی نے کافی عرصہ گذارا مگر وہ مالی مشکلوں میں برابر مبتلا رہے ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدرآباد گئے اور وہاں ۱۹۴۱ء تک صدر مدرس رہے۔ حیدرآباد میں آخر میں فانی کی زندگی جو یوں بھی کم سوگوار نہ تھی اور بھی تلخ ہو گئی لڑکوں نے کچھ نہ کیا۔ جو ان لڑکی ۱۹۳۲ء میں مر چکی تھی ۱۹۴۰ء میں بیوی بھی رخصت ہوئیں۔ اس عالم میں ان پر جو گذری اس کا کچھ اندازہ اس مادہ تاریخ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اپنی موت کا نکالا تھا۔

آواز جہاں سے مت کہ آخر خدا نبود
اولی چناں نزیست کہ گوئی خدا نداشت

طغیان ناز ہیں کہ یہ لوح مزار او
شت است در رساں زطلت فانی خدا نداشت

غالب تو حسرت یہ کہہ کر رہ گئے
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

زندگی اپنی جب اس شان سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ فانی رکھتے تھے

لیکن فانی اس سے آگے بڑھے "خدا نداشت" اس مایوسی اور تلخی کی آئینہ داری کرتا ہے، جو اس زمانہ میں ان کی طبیعت میں آ گئی تھی بھوپال کے مشاعرے میں ان کی شرکت کی وجہ سے بڑی رونق ہو گئی تھی۔ شمالی ہند والوں نے ان کی زبانی آخری بار ان کی غزل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی مہربانی سے اس اس کا مطلع یہ تھا۔

ع
جب پرسش حال وہ فرماتے ہیں جانے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی نہ بات نہیں کھلتی کچھ [illegible]

ان کی ایک اور [illegible] اسی مشاعرے میں جو جس نے پڑھی تھی اس [illegible] مقطع یہ تھا۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان ہے "دور"

فانی بڑے خلیق اور منکسر مزاج آدمی تھے مگر ان میں ایک سچے شاعر کی خودداری اور غیرت پوری طرح موجود تھی انہوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ انہوں نے معاصرین کی برائی کر کے کبھی اپنا دل ٹھنڈا نہیں کیا۔ ان کی شہرت تو بہت ہوئی مگر اس قدر کا حصہ نہیں ہوئی خود ان کے الفاظ ان کی ساری زندگی ایک مقدس قسم کا تماشا رہی جسے لوگ دور سے دیکھ دیکھ کر اثر لیتے رہے، ان کا دم نکلنے نہ دیکھا مگر سمجھے کہ تمام عمر اس پر نزع کی کیفیت طاری رہنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک یونیورسٹی میں ایک معمولی عہدے کے امیدوار تھے تو یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا گیا کہ آپ نے کچھ ریسرچ بھی کی ہے

یا نہیں۔ ہرن پر گھاس لادنے کی اس سے بہتر مثال شاید ہی ہو سکے۔

فانی کا رنگ مبہم تھا وہ ساری عمر غزل لکھتے رہے وہ غزل ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ غزل اور نظم محض میں فرق کرتے تھے ان کا ایمان یہ تھا کہ شعر کو کسی خاص غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جا سکتا۔ خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہی زندگی برائے ادب والا نظریہ ہے اور اس دور میں اس کی اس کی نارسائی واضح ہو چکی ہے۔ فانی کا یہ بھی خیال تھا کہ جس دنیا میں شاعر کا ظہور ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے ہوا کرتی ہے انہیں اس کا یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ بلندی فرضی ہے ورنہ شاعر دراصل اپنے ماحول، اجتماعی اثرات ذہنی الجھنوں اور مادی مشکلات سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ اقبال کے زیادہ قائل نہ تھے۔ اس لئے کہ ان کے ذہن میں شاعری کا ایک خاص تصور اس قدر روشن تھا کہ وہ دوسرے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

مگر بڑی بات یہ ہے کہ فانی کی شاعری ہمارے ادب میں ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ فانی نے غزل کی صورت یا موضوع میں کوئی تبدیلی نہیں کی انہوں نے غزل کی زبان بھی نہیں بدلی۔ بظاہر ان کے یہاں وہی آشیاں اور قفس زنداں اور صحرا جنازہ اور کفن اور پروانے ملتے ہیں جو ان سے پہلے نظم کرتے آ رہے ہیں مگر شاید کم لوگوں نے یہ علامتیں اس قدر صداقت سے استعمال کی ہوں گی جتنی فانی نے۔ فانی کے یہاں یہ چیزیں رسمی طور پر نہیں ہیں ان کی زندگی ہی ان سے عبارت ہے۔ میر کا ایک مشہور شعر ہے۔

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دیکھئے فانی کے یہاں بہار کیا لائی ہے۔

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید　　کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے

دراصل اردو شاعری میں میر کے بعد اگر کوئی بے پایاں درد لامحدود یاس اور بے کراں غم کا مالک ہے تو وہ فانی ہے۔ پھر بھی ان شاعری بعض لکھنوی شعرا کی طرح رونی بسورتی نہیں ہے۔ ان کے یہاں غم کا ایک عرفان ملتا ہے جو زندگی اور موت دونوں کو گوارہ بنا دیتا ہے۔ فانی موت سے گھبراتے نہیں وہ موت کا خیر مقدم کرتے ہیں ہمارے کتنے ہی شاعر اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ موت سے آنکھیں چار کرسکیں، وہ غم سے بھاگ کر یا تو "جوش تغزل" میں پناہ لیتے ہیں یا مے اور شاہد کے آغوش میں" فانی کے یہاں یہ پناہ گزینی کا جذبہ نہ ملے گا، وہ تلخی حیات کو زہر کہہ کر چھوڑ نہیں دیتے ایک حقیقت نگار شاعر کی طرح وہ اس تلخی سے واقف ہیں وہ اس تلخی کو عزیز رکھتے ہیں ؎

بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

فانی کے یہاں شروع میں لکھنؤ کے اثر سے لہجہ میں بھری ہوئی پلپلائی، دیدار میت، لاش کی بے زبانی بہت زیادہ تھی بعد میں غالب کے اثر سے انہیں فلسفہ غم سے زیادہ دلچسپی ہوئی۔ غالب اردو کے پہلے صاحب فکر شاعر ہیں، انہوں نے جوانی دیوانی کی داستان بیان کرنے یا خشک نصیحت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حیات و کائنات کے مسائل کو شاعرانہ زبان میں بیان کیا۔ ان کا کلام ایک غیر معمولی ذہین آدمی کا کلام ہے ان کی شخصیت بڑی دلکش اور دلآویز ہے ان کی زبان ان کی اپنی ہے۔ مانگے کی نہیں، ان کی ترکیبیں خیال آفریں ہیں اقبال اور فانی ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں، اقبال نے غالب کی عظمت کو اختیار کرلیا فانی نے غالب سے اسلوب فکر کو غالب کا شعر فانی کے یہاں سادگی سے ملتا ہے۔ مگر جنہوں نے فانی کو فانی بنا دیا وہ غالب نہیں میر ہیں۔ غالب کے یہاں جو اثر بیدل کا ہے وہ فانی کے یہاں غالب کا ہے، فانی کے فلسفانہ اشعار

اتنے ہی نہیں جتنے ان کے وہ اشعار جو میر کے رنگ میں ہیں فلسفیانہ اشعار
میں بعض وقت فانی الفاظ میں الجھ جاتے ہیں۔ میر کے رنگ وہ بعض وقت بہت
بھی پائندہ ہو جاتے ہیں۔ میر اور غالب ان دونوں کے رنگوں سے فانی کا رنگ
بنا ہے۔ اگرچہ اس میں حسرت کی جھلک بھی ہے پہلے جھلک دیکھئے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال
میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

کیوں سادگی میں طعنہ بھی اب بانکپن کے ہیں
اب تک تو سادگی کی ادا بانکپن کی تھی

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

فانی کے اشعار میں بلا کی تاثیر ہے یہ تاثیر زبان پر حیرت انگیز قدرت
کی وجہ سے بھی ہے عرفانیات ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی مرنے سے چند ماہ قبل
وجدانیات کے نام سے ایک اور چھوٹا سا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس میں عرفانیات
کے بعد کے اشعار تھے دونوں میں صاف اور سادہ شعر بہت ملتے ہیں ان میں
صرف خیال ہی سادہ نہیں کہیں کہیں بڑی بلاغت بھی آ گئی ہے فلسفیانہ اظہار
آخر تک ہے، مگر فلسفیانہ اشکال کم ہو گیا ہے میر کی چھوٹی بحریں بھی بکثرت
ملتی ہیں دل کی زندگی اور شاعری میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ دوسری جگہ کم نظر آئے گی
وہ ہمارے صاحب فکر شاعروں میں سے ہے۔ اردو کے اچھے اچھے اشعار کا جب
کوئی مجموعہ تیار کیا جائے گا۔ تو فانی کے بہت سے اشعار ممتاز جگہ پر ہوں
گے۔ شاید ان میں سے چند یہ ہیں۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

پھولوں سے تعلق اتنا ہے مگر اتنا — جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی — اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات — جب مزاج حسن کچھ برہم نظر آیا مجھے

منزل عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی — تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

اچھا یقین نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

اللہ رے سکون قلب اس کا دل لاکھوں جس نے توڑ دیئے

جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل — غریب کشمکش خیر و اختیار میں ہے

آخر میں فانی کی تین رباعیاں بھی سن لیجیے جن کے مصرعے کو پڑھتے وقت خیال ہوتا ہے کہ واقعی دل پر چھری چل رہی ہے۔

(۱)
بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے — کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی — سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

ناکام ازل کی کامرانی معلوم — قسمت میں ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید — ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

(۳)
عالم بدلا فضا سے عالم بدلی — ہر شے بے اختیار و پیہم بدلی
ہاں اک مری تقدیر کہ بدلی ہی نہیں — اک مری طبیعت کہ بہت کم بدلی

ان کی زندگی تو ختم ہوئی مگر ان کے اشعار کی زندگی عرصہ دراز تک قائم رہیگی۔



رتن ناتھ سرشار

شکسپیر کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ اس نے اپنی تصانیف بہت جلدی میں اور بے تکان لکھی ہیں۔ اس کے ڈرامے ایک بے حد مصروف زمانے کی یادگار ہیں جب کہ وہ اداکار بھی تھا اور ڈرامہ نویس بھی، شاعر بھی تھا اور منیجر بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ملکہ ایلزبتھ کے ذریں دور کی ہنگامہ خیز سکون نا آشنا رومانوی فضا میں شریک بھی تھا، اس کی عظمت کا ایک بڑا راز یہ بھی سمجھا جاتا ہے جو جواہر پارے، اس قدر عجلت میں لکھے گئے تھے، ان کی آب و تاب افتادِ زمانہ کے بعد اب بھی قائم ہے۔

اردو ادب میں ایسے بہت سے حضرات کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن کے جوہر قابل سدا بے اصولی اور بے پروائی کے شکار رہے۔ انہوں نے نہ تو اپنا کوئی ادبی نصب العین متعین کیا اور نہ ساری دنیا کو چھوڑ کر اسی نصب العین کے ہو گئے اور باوجود اس کے ایسی ایسی یادگاریں چھوڑیں کہ ان کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا ہے، فہرست طویل ہے مگر اس فہرست میں سب سے ممتاز نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔

سرشار ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ہمارے سماج اپنے خزانوں آسانی سے نہیں اگلتا ایک مشرقی ادیب کے حالات زندگی پردہ خفا میں رہ جاتے ہیں اور باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوتے چاسر چودھویں صدی میں گذرا ہے مگر اس کی زندگی کی اہم کڑیاں مل جاتی ہیں سرشار نے انیسویں صدی پائی پھر بھی ان کے حالات زندگی اچھی طرح معلوم نہ ہو سکے۔ گوئٹے کے دانت کے درد کے متعلق مغرب میں اس قدر تفصیلات فراہم ہو جاتی ہیں کہ اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جا سکے ہماری یونیورسٹیاں جب اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہی کی معترف نہیں تو پھر یہ گوہر گراں بار کیسے برآمد ہوں۔ بہر حال رتن ناتھ کی رہائش کا حال ٹھیک معلوم نہیں لیکن غالباً ۱۸۴۵ء یا ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے کشمیری ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق ہوئی۔ اس زمانے میں عربی، فارسی کی تعلیم شرفاء کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بغیر نہ تعلیم مکمل ہوتی تھی نہ تہذیب۔ سرشار نے یہ سب سیکھا اور اس کے بعد انگریزی کی تحصیل کے لئے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ مگر اس میدان میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکے شروع ہی میں ہمت ہاری۔

سرشار اول کھیری میں مدرس ہوئے اور چونکہ آدمی ذہین اور طباع تھے اور ادب سے فطری دلچسپی تھی، اس لئے مراسلہ کشمیر، اور اودھ اخبار میں مضامین لکھنا شروع کئے، اسی زمانے میں انہوں نے ہیئت کی ایک کتاب کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور موضوع کی رعایت سے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ صوبہ کے ڈائرکٹر تعلیم انکے ترجموں کے بڑے مداح تھے۔ اور انہیں کی سفارش سے سرشار کو ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ایڈیٹری مل گئی۔ فسانۂ آزاد اسی اخبار میں بالاقساط نکلا اور ۱۸۸۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ فسانہ جب اودھ اخبار میں چھپتا تھا تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوسرے پرچے کے منتظر

رہا کرتے تھے چکبست کا بیان ہے کہ اس کے لکھنے کے لئے کبھی مصنف نے کوئی خاص زحمت گوارا نہیں کی۔ کاتب بیٹھا ہوتا تھا اور یہ نوجوان افسانہ نویس کو داستان کا ٹکڑا قلم برداشتہ گھسیٹ دیتا تھا یہ لکھنے والے کی خوبی اور فسانہ کی خامی کی دلیل ہے فسانۂ آزاد کے شائع ہوتے ہی سرشار کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی چنانچہ ان کی دوسری تصانیف کا جو اس پایہ کی نہیں تھیں بہت پرجوش خیر مقدم ہوا۔ اسی زمانہ میں ان سے اور اودھ پنچ سے معرکے رہے اودھ پنچ کا معیار صنعتی تھا۔ اس کے سارے قلمی معاون اسی میدان کے مرد تھے فسانۂ آزاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے لازوال مرقعے پیش کیے گئے ہیں اودھ پنچ کو اس سے اختلاف تھا اس اختلاف میں شخصی اور ذاتی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا، آخر یہی چیز اس پرچے کو لے ڈوبی۔

سرشار کی آزاد منشی اور لاابالی طبیعت ان کو کہیں جمنے نہ دیتی تھی آخر عمر میں وہ تلاش معاش میں حیدر آباد گئے اور دبدبۂ آصفی نکالا شروع میں ان کی بڑی قدر ہوئی لیکن چونکہ وہ ملازمت کی بندگی دبے بچارگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے بعد میں انہیں بڑی دشواریاں اٹھانی پڑیں شراب نوشی کی کثرت نے انہیں وقت سے پہلے بجھا دیا اور ۱۹۰۳ء میں وہ تپ دارِ دل میں انتقال کر گئے۔

سرشار کی ذہانت وطباعی کے دشمن بھی قائل تھے اس شخص نے خداداد قابلیت کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا کبھی اس کی قدر نہ کی امریکہ کا مشہور سائنس دان ایڈیسن ذہانت کو ۹۹ فیصد پسینہ اور ایک فی صدی وجدان کہتا ہے۔ سرشار کی ساری زندگی اس کے برخلاف ایک قہقہہ ہے وہ زندگی اور مسائل کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس

پر خون پسینہ ایک کیا جائے اس کا مذاق اڑاتا ہے خود ہنستا ہے۔ دوسروں کو ہنساتا ہے اور ہنسی سے زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنا لیتا ہے اس نے کبھی اپنی تصانیف پر نظر ثانی نہیں کی بہت لکھا۔ بے خیالی سے لکھا اور بے تکان لکھا، اور یہ جانتے ہوئے جب ہم اس کی تصانیف پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے نکھرے پن اور فطری رنگ پر حیرت ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں سرشار کی زندگی کے ایسے واقعات نہ مل سکے جہاں وہ اپنے بے تکلف احباب کے مجمع میں فطرت کے دریا بہاتے ہوں گے۔ چکبست جیسا قدردان بھی سرشار کا ذکر نہایت محبت بھرے الفاظ میں کرتا ہے۔ صرف اشارات سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ قیاس غلط نہیں ہو سکتا کہ فسانہ آزاد کا مصنف اپنے دوستوں میں جو پھلجھڑیاں چھوڑتا ہو گا ان کی بہار بڑی دلفریب ہوتی ہو گی۔

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ مصنف سے الگ اپنی حیثیت قائم کر لیتی ہیں۔ کوئی ان کے مصنف کو جانے یا نہ جانے۔ انہیں ضرور جانتا ہے اور ان کتابوں کی حیثیت اس کے نظام زندگی میں ویسی ہی مستقل ہوتی ہے، جیسے دو کی دوسری چیزوں کی فسانہ آزاد کی بھی کیفیت ہے ممکن ہے بہت سے ایسے ہوں جو سرشار کو نہ جانتے ہوں لیکن ایسے کم نکلیں گے جو آزاد اور خوجی حسن آرا اور اللہ رکھی ہمایوں فر اور نہ سپہر آرا، سپہ آرا اور وکیل صاحب نواب صاحب اور ان کے مصاحبین کو نہ جانتے ہوں اور اپنی گفتگو میں ان کا ذکر کرتے ہوں فسانہ آزاد صحیح معنی میں اردو کے ادب میں شمار کئے جانے کے

ناول ہے یہ ایک آزاد افسانہ ہے جو آج کل کے آزاد ترجموں سے بہتر ہے اگرچہ اس میں فسانے کے تمام اصولوں کی پوری طرح پابندی نہیں کی گئی مگر پھر بھی اس کے بلند پایہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایک اچھا مصور یا ایک اچھا شاعر بہت سی اچھی تصویریں کھینچتا ہے بہت سی اچھی نظمیں لکھتا ہے، لیکن ان میں سے ایک تصویر یا نظم اس کے کمالات کا آئینہ اور اس کے فن کی معراج ہوتی ہے اور وہ ایک دفعہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔ ایک ہی بار اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے بعضوں کی ابتدائی تصانیف میں صرف اس کے اشارے ملتے ہیں۔ پہلے ہلکا ہلکا دھندلکا نظر آتا ہے پھر صبح ہوتی ہے تب جاکر خیال اور زبان کا توازن شخصیت اور ذہنی شعور کا کامیاب اتصال ہوتا ہے یہ لوگ عمر کے ساتھ شعور فن میں ترقی کرتے ہیں۔ خود بڈھے ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کا کمال جوان رہتا ہے، یہ حال غالب اور اقبال کا ہے سرشار اس زمرے میں نہیں آتے عمر کے ساتھ ان کے کمال میں ضعف آ گیا شرر شعلہ نہ بن سکا خاکستر میں تبدیل ہو گیا۔ سرشار نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں مگر فسانۂ آزاد ہی ان کا شاہکار ہے اسی وجہ سے وہ زندہ ہیں ان کی دوسری کتابیں ان کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اُردو میں قصے کہانیوں اور افسانوں کی کمی نہیں ہے اور یہ قصے کہانیاں اپنے رنگ میں منفرد بھی ہیں۔ پھر فسانۂ آزاد کی مقبولیت کا کیا راز ہے۔ لے کر یہ ناول کے اصول پر بھی پورا نہیں اترتا اور تنقید کے جدید اصولوں کی رو سے اس میں بڑی کامیاں ہیں اس سے پہلے کے قصے خلاف فطرت تھی دلچسپ ضرور ہیں طلسم ہوشربا

دبا لیجئے۔ اس کے ناپسند ہونے کی یہ وجہ نہیں ہوسکتی کہ وہ دلچسپ نہیں ہیں کیونکہ خاص خاص مقامات کو چھوڑ کر اس کے اکثر حصے اپنے رنگ میں انوکھی دلچسپی رکھتے ہیں تخیل کی ان میں کمی نہیں، زبان بھی اچھی اس بری نہیں یا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اپنے طرز میں لاجواب ہے مگر کمی بات یہ ہے کہ محض خیالی طوطا مینا بنانے سے کام نہیں چلتا خیال بندی اور خیال آفرینی بہت اچھی چیز ہے، مگر جب آدمی اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو کسی کام کا نہیں رہتا طلسم ہوشربا میں سب کچھ ہے ناول اور افسانے کا بنیادی اصول ان میں پایا جاتا ہے یعنی تفریحی پہلو اس میں کردار نگاری کی بھی کوشش ہے اگرچہ دھندلی ہی سہی۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت کے بھی مل جاتے ہیں ان میں طرز بیان کی خوبی بھی ہے ان کا ایک اخلاقی پیغام بھی ہے مگر جو کچھ ہے بے جان ہے اس لئے کہ زندگی سے ان کا ایک اخلاقی حقیقت نگاری کی ضرورت ہے واقعیت درکار ہے۔ اور بنتی، بگڑتی چلتی اور بڑھتی ہوئی زندگی کی عکاسی ادب کے ہر شعبے میں ہونا ضروری ہے۔ اب ضرورت ہے کہ خیالی تصویروں کے بجائے ایسی تصویریں ہوں جنہیں پڑھنے والے پہچان لیں اور ان میں انہیں جیتی جاگتی۔ چلتی پھرتی روزمرہ ملنے والی جانی پہچانی شکلیں دکھائی دیں فسانہ آزاد کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے اسے پڑھتے وقت پلاٹ کا تناسب سیرت نگاری کے اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی کو ذہن میں رکھنا ضروری نہیں بلکہ اسے تھوڑی دیر کیلئے نظرانداز کیا جائے تو بہتر ہے، اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور یہ نقشہ زندگی کے عین مطابق ہے نواب اپنے مصاحبین کے جھرمٹ میں گھرے گھی پٹرے کے اڈے پر ماتم کرتے ہیں کبھی جنگ

ردم در روس میں اس کے کارناموں پر خوش ہوتے ہیں، کبھی کبھی اس کا مقبرہ بنواتے ہیں۔ کبھی خوجی کو گالی دیتے ہیں کبھی خلعت سے سرفراز کرتے ہیں مہربانی کہیں نوابوں سے آنکھیں لڑاتی ہیں کبھی کہار دل سے ضلع جگت میں طاق ہیں زبان تر طرار پڑ اق چلتی ہے، بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتی ہیں، شعر پڑھتی ہیں اور لطف اٹھاتی ہیں چھیڑتی ہیں اور گدگداتی ہیں۔ مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں۔ محرم کا مہینہ ہے عیش باغ کے جلسے ہیں، آم اور الوچے کی فصل میں شہر پر بہار ہے، سارا شہر آم جوں اور جوبڑہ نگر بنا ہوا ہے۔ نوکر آقا سے فقرہ بازی کرتا ہے۔ آقا نوکر سے نہیں چوکتا بوڑھے جوان، بچے، مرد، عورتیں، نواب، امیر، رئیس، سپاہی، فقیر، چور قاتل، شہ سوار، ربقار سرشار، بانکے، شوقین، رنگیلے سیار سب کی بھیڑ ہے اس پردے پر لکھنے والے نے اس قدر تصویریں کھینچی ہیں کہ سب کا پہچاننا اور یاد رکھنا دشوار ہے یہ سب آپس میں دست و گریباں ہیں، محبت دوستی رشک وحسد میل ملاپ جنگ و خون ریزی، ہنسی مذاق، معصومیت شیطنیت سب ہی سے تو واسطہ پڑتا ہے اور سب نے مل کر پوری تصویر کو لگ بھی کر دیا ہے اور اس میں ایک عجیب فقید المثال واقعیت بھی بھر دی ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

سرشار شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لائے تھے وہ جب فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں تو بھی ان کے قدم زمین پر ٹکے رہتے ہیں ان کی تصویروں میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی وہ جب کوئی واقعہ یا منظر بیان کرتے ہیں تو اس کی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ عام طور پر اچھائیاں اور برائیاں بیان کرنے پر قانع نہیں۔ جہاں کہیں انہوں نے ایسا کیا ہے وہاں

سرشار نہیں رہے۔ اخلاقی مسائل بھی سرشار کے بس کے نہیں۔ چنانچہ جب کبھی انہوں
نے بھیا صوفی کے متعلق وعظ و پند سے کام لیا ہے وہاں وہ اپنے اصلی میدان سے
دور جا پڑے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑے ہنسوڑ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی
یہی ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار صفحات کے باوجود گرمیٔ کلام میں زیادہ فرق نہیں
آیا۔ سرشار کی ظرافت ایک تندرست دل و دماغ کی ظرافت ہے جو ہنسنے کے لئے
زندہ رہتا ہے۔ ان کی ظرافت کسی خاص مقصد اخلاق کے لئے نہیں ہے۔ وہ
سب ہنستے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے اوپر بھی۔ سامان کے انداز بیان کی شوخی ظریفانہ
چٹکلے فقرے بازیاں، اجنبی اشخاص کے نقشے۔ بدتمیز نوکر اور بدتوفیق آقا
کے مکالمے محل سرا کی تصویریں سب ایسی ہیں کہ انسان کو ایک سیلاب تبسم میں
بہالے جاتی ہیں۔ فطرت انسانی کے علم اور نچلے طبقے کے افراد و واقفیت کے لحاظ سے
سرشار اردو کے ڈکنس ہیں اور ظرافت کے لحاظ سے والٹیر۔ مکالے نے والٹیر کے
متعلق کسی جگہ لکھا ہے کہ وہ جب لوگوں کو ہنسانا چاہتا تو خود ہنستے۔ لگتا ہے
سرشار بھی یہی کرتے ہیں۔ فسانہ آزاد کے علاوہ سرشار کی تصانیف میں خدائی فوجدار
اور سیر کہسار ممتاز ہیں۔ خدائی فوجدار مشہور کتاب ڈان کوئیکزٹ کا آزاد ترجمہ
ہے اس میں بھی سرشار نے اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ سیر کہسار میں
وہ ہندو خاندانوں کے حالات بھی بیان کرتے ہیں مگر یہاں ان کو معلومات
بہت بلند نہیں۔ فسانہ آزاد کی داستان طویل نہیں معلوم ہوتی۔ سیر کہسار
پڑھتے وقت یہ احساس ضرور ہوتا ہے پلاٹ کمزور ڈھیلا ہے۔ تاہم نسبتاً
بہت پسند نہیں۔

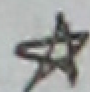
سرشار کا مقابلہ ایک طرف رجب علی بیگ سرور سے کیا جاتا ہے دوسرا

طرف شرر سے۔ در حقیقت سرشار دونوں کے درمیان کی کڑی ہیں۔ سرور کے انشا اور ماتہ اگرچہ ایک ہی ہے مگر دونوں میں فرق بہت ہے۔ سرشار کے افسانے ایک طرح ایڈیشن کے کوورلی پیپرس (COVERLV PAPERS) سے ملتے جلتے ہیں۔ الگ الگ واقعات و خیالات کو ایک رشتہ میں گوندھا گیا ہے۔ شرر کے انشائے قصے کے لحاظ سے مکمل اور ممتاز ہیں۔ سرشار کے افراد اپنی خصوصیات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ نمایاں معلوم ہیں۔ شرر کے سب ہیرو اور ہیروئن ایک سا ہی سانچے میں ڈھلے ہیں منصور عزیز یا اور زیادہ میں کوئی فرق نہیں۔ نام اور مقام الگ ہیں قوت مشاہدہ کا استعمال شرر کے یہاں کم ہے مگر ان کے پلاٹ مکمل ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں ادب کبھی ایک قسم کی صورت گری ہے اور کسی صورت کے بنانے کے لئے پہلے اس کا ڈھانچہ بنانا ضروری ہے۔ سرشار اس نقطہ سے واقف نہ تھے یہی وجہ ہے کہ فسانۂ آزاد افسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

غرض سرشار کے فسانوں میں فن کے لحاظ سے کئی نقائص موجود ہیں۔ لیکن ان کی دلچسپی اور ادبیت میں ان سے کوئی فرق نہیں آیا اور غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اس زمانے کی بڑی اچھی تصویر پیش کرتے ہیں۔

بہت سے نقاد اب تک سرشار کو اُردو کا پہلا ناولسٹ اور فسانۂ آزاد کو اُردو کے اس رنگ کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ فسانۂ آزاد ۱۸۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس سے بہت پہلے ۱۸۶۹ء مولوی نذیر احمد کی مراۃ العروس اور غالباً ۱۸۷۱ء میں توبۃ النصوح شائع ہو چکی تھی نذیر احمد اُردو کے پہلے ناولسٹ ہیں یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے مگر اس سے سرشار کے افسانوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ایک مٹتے ہوئے تمدن اور جاتے ہوئے زمانے کی تصویریں سرشار نے بڑے مزے سے پیش کی ہیں۔

کسی ادیب کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس کے کارناموں میں دیوزادوں کی سی وسعت خیال اور جوہریوں کی سی بینا کاری دونوں کی جھلک نظر آئے یہ چیز سب کے بس کی نہیں؛ وسعت روسیوں کی صفت ہے گہرائی جرمنیوں کی جین آسٹن مشہور ناول نویس نے اپنے لئے زندگی کا ایک بہت چھوٹا سا کونا انتخاب کیا تھا مگر اس دنیا کے چپہ چپہ سے اسے اچھی طرح واقفیت تھی اور اس کی تمام ناولیں اس کی شاہد ہیں۔ سرشار کی تصانیف میں دیوزادوں کی سی وسعت خیال پائی جاتی ہے۔ بینا کاری ان کے بس کی نہیں۔ یہی ان پر سب سے بہتر تبصرہ ہے۔



ہندوستانی ادب میں آغا حشر کا درجہ

آغا حشر کی موت کو آج چھ سال ہو گئے انہوں نے اپنی ساری زندگی ڈرامے کے لئے وقف کر دی تھی اس کے ذریعہ سے انہوں نے روپیہ بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی یہی نہیں بلکہ انہوں نے ڈرامے کے فن کو بھی بلند کیا خود بھی فن کی منزلیں طے کیں اور فن کو بھی ترقی دی۔ اس میں اپنی بلند آہنگ شخصیت اور بے پناہ قدرت سے وسعتیں پیدا کیں جذبات کے ہیجان میں طوفان کا زور اور موجوں کا شور دکھایا، تیز شہنائی اور نند نقارے سے کان بہرے بھی کئے اور ہلکی اور لطیف کیفیتوں سے روح میں اہتزاز بھی پیدا کیا، انہوں نے اپنا واسطہ براہ راست عوام سے رکھا اور عوام کے راستے وہ خواص کے دلوں تک پہنچے ڈاکٹر جانسن کے مقولے پر انہوں نے ساری عمر عمل کیا قبول عام کسی کی مقبولیت کی آخری سند ہے۔ عوام نے انکو دل کھول کر داد دی وہ زندگی ہی میں انڈین شکسپیر کہلائے۔

مگر غلطی جتنی بڑی ہو اتنی ہی اسے شہرت ہوتی ہے اور اتنی ہی دیر میں

اس کی اصلاح ہوتی ہے، آخر انہیں انڈین شکسپیر کیوں کہا جاتا ہے اور کہاں تک صحیح ہے! شاید اس وجہ سے کہ انہوں نے شکسپیر کے بہت سے ڈراموں کا ترجمہ کیا تھا یا شاید اس وجہ سے کہ انہیں اپنی زندگی میں شکسپیر کی طرح شہرت حاصل ہو گئی تھی یا اس لحاظ سے کہ دونوں شاعر تھے اور دونوں نے اپنے ڈراموں میں شاعری کے اچھے اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ دونوں میں سے مماثلت نہیں ملتی، شکسپیر کے کردار غیر فانی ہیں۔ اس کی زبان معنی آفرینی اور حسن کاری کا بہترین نمونہ ہے، وہ انسانی فطرت کا بہت بڑا نباض ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس سے پوشیدہ ہو۔ اس کی ظرافت تندرست ہے مریض نہیں، اس کا شعورِ فنی بے مثل اور اس کی نگاہ دوربین ہے۔ وہ سولہویں صدی کے انگلستان میں رہتا ہے، مگر ایسے پیکر تراشتا ہے جو ابدی ہیں۔ اس کی شاعری اور ڈرامہ نویسی دونوں کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس نے ڈرامے کو کیا پایا یا چھوڑا۔ اور حشر نے کیا پایا، اور کیا چھوڑا، آپ نے ذرا دیکھیں تو ہی حشر نے آنکھ کھولی تو پارسی کمپنیاں دیکھیں، کمپنیوں کے منیجر روپیہ کمانے کے گر سے واقف تھے۔ فن کی انہیں پرواہ تھی، اندر سبھا کی مقبولیت دیکھ کر انہوں نے اس قسم کے قصے بھی لکھوانے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی انگریزی کے غلط سلط ترجموں سے بھی کام لیا، وہ جہاں ضرورت سمجھتے۔ اس قصے میں ترمیم کر لیتے اشخاص کو ہندوستانی لباس دے دیتے۔ جہاں چاہتے بیچ کے سین نکال دیتے جہاں چاہتے دوسرا قصہ شروع کر دیتے، کامک کے نام سے فضول اور بے معنی کردار شامل کر دیتے۔ گانا مقفیٰ عبارتیں، منظوم گفتگو۔ بادشاہ کا گا کر حکم دینا فوج کا گا کر لڑنا جوان عورتوں کا بستر مرگ پر گانا اور جان دینا ایک ہنگامہ جس میں نوحۂ غم اور نغمۂ شادی دونوں ہے ہیں۔ اور رکیک مکالمے عریاں اشارے

کہا کہ غرض شروع شروع میں ڈرامے سب کچھ تھے مگر فن سے انہیں اتنا ہی تعلق
تھا جتنا اردو شاعری میں عاشق کو خوشی سے دن بھر کے تھکے ہارے تردد تلی ...
دو کاروبار شوقین، اسٹیج پر خون ریزی کی ہنگامہ، دیو، پری، پرستان حسن و
عشق کے مناظر دیکھنے آتے. ان کی ایکٹنگ اسی طرح ہو سکتی تھی ڈرامہ تو زندگی کی
کشمکش کی نقل ہے یہاں نقل ہی نقل تھی، زندگی اور اس کی کش مکش غائب. حشر
نے اپنے پہلے اور دوسرے دور میں یا تو شکسپیر کے ڈراموں کے ترجمے کئے یا قدیم
طرز کے ڈرامے لکھے. شکسپیر کے ترجموں کا چسکا ان سے پہلے شروع ہو چکا تھا
چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احسن نے سب سے پہلے شکسپیر کے ڈراموں کے
ترجمے کئے مگر اس سے بھی پہلے کلکتہ اور بمبئی کی کمپنیوں کے انگریز مالک انگریزی
قصوں کے ترجموں سے کام چلاتے تھے. ان ترجموں میں صرف قصہ لیا جاتا تھا.
اور اکثر اس میں کچھ ترمیم ہوتا تھا. خود حشر کے یہاں اصل کا بہت کم لحاظ رکھا
گیا ہے. کبھی پوری پوری داستانیں چھوڑ دی گئی ہیں. کبھی قصہ کا رخ موڑ کے
المیہ سے طربیہ بنا دیا گیا ہے. کبھی وہ کردار شکسپیر کی جان تھے مگر جن کی عکاسی
کے لئے ذرا گہری نظر کی ضرورت تھی. نظر انداز کر دیئے گئے. خود احسن کے ہاتھوں
ہملیٹ کا کیا حشر ہوا حشر کے شہید ناز اور (MEASURE FOR MEASURE)
میں بڑا فرق ہے صید ہوس اور کنگ جان (KING JOHN) مرید شک
اور اتھیلو OTHELLO سفید خون اور کنگ لیئر سب کا یہی حال ہے. کنگ لیئر کو
بھی المیہ کی بجائے طربیہ بنا دیا گیا ہے، مگر جب یہ خیال آتا ہے کہ خود انگلستان
میں ایک عرصے تک یہی کیا گیا ہے تو غریب حشر کا گناہ کم ہو جاتا ہے، وہاں بھی
کے بعد یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ کنگ لیئر کے خاتمے کو آبشار
برابر ہے صید ہوس کے ایک مکالمے سے اندازہ ہو سکتا

ہے کہ حشر نے اس دور میں تمام پچھلی خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ ان کی شاعری کی وجہ سے اس میں ایک خاص بات ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ نادر اپنے بھائی دارا کو قتل کرنے کے بعد خود تخت کا دعویدار ہے۔ دارا کی ملکہ مہرا سے ملامت کرتی ہے۔

نادر! پچھتائے گی رگا کے یہ الزام دیکھنا
مہر! سب کام ہو چکے ہیں۔ اب انجام دیکھنا
نادر! بے وقوف!
مہر! ظالم
نادر! تو جنونی ہے
مہر! تو خونی
نادر! تو مجھ پہ الزام لگا رہی ہے جو میری طرف سے معاف نہ ہوگا۔
مہر! تو نے اس خون سے ہاتھ بھرا ہے جو فرشتوں کے آنسوؤں سے بھی صاف نہ ہوگا۔

جب ایک مکیں پہ ہو رہا تھا ستم تیری تیغ آہنی کا!
فلک تھا دہشت سے تھر تھرانا لرز رہا تھا جگر زمیں کا
قریب یاد دور روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون جگر کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکار یگا آستین کا

شکسپیر کے جتنے ڈراموں کے پلاٹ لیے گئے ہیں ان میں شکسپیر کے ساتھ بڑی جسارتیں کی گئی ہیں۔ ان کے سارے مزاحیہ حصے نکال کر ان کی جگہ ہندوستانی کائک رکھے گئے ہیں اور حشر اس معاملہ میں اپنے ناظرین سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں ان کا مذاق دراصل گالی گلوچ اتات گھونسے ٹھیکرے ڈھول دھپے والا مذاق

ہاہے۔ حشر کے یہاں اگر شدت نہیں تو کچھ بھی نہیں، جیسے دیکھو دو چار لاتیں پانسات گھونسے، دس بارہ گالیاں کھاتا ہے، مگر کیا مجال کہ ذرا بدمزہ ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کامک بانڈ اور کے بعض لوگوں کو بلا کر سنادیا کرتے تھے، اور اگر گنڈیریاں بیچنے والا خوش ہو جاتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ مزاح کامیاب ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس سے حشر کے مذاق کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ انکے پہلے اور دوسرے دور کے ڈراموں میں اعلیٰ قسم ظرافت خالی خالی ہے شکسپیر نے بھی اپنے زمانے کی خاطر گیلری کی داد حاصل کرنے کے لئے قلابازیاں سے کھائی ہیں، اور مداری کا تماشا دکھایا ہے، مگر اس نے غیرفانی مزاحیہ کردار بھی چھوڑے ہیں، سنجیدہ ظرافت سے بھی کام لیا ہے حشر کے یہاں اچھی مثالیں کم ہیں صید ہوس میں سرخاب گم آتا ہے تو سفر کی تکلیفیں اس طرح بیان کرتا ہے۔

"پھانسی سب کو ایک دم پھانسی۔۔ ان گاڑی والوں کا ظلم کسی کو سوجھتا نہیں، راستہ میں لوگوں کو لوٹتے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں اب تو بیوقوف کا مریل گھوڑا، اس پہ اس کو پرائی گاڑی میں جوڑا، اور ہاتھ میں نہیں کوڑا۔ مارے ہچکولے کے بدن ہو گیا پھوڑا پیٹ میں اٹھنے لگا مروڑا، اتنی تکلیف پر بھی کم بختنے نے ایک روپیہ کرایہ اور چار آنے انعام لے کر چھوڑا۔"

دوسرے دور میں حشر نے گانوں میں کچھ کمی کی، منظوم گفتگو بھی کم ہوئی مگر مقفیٰ عبارت بدستور قائم رہی نثر کے ایک دو جملوں کے بعد ایک نہ ایک شعر کا آجانا نثر کے یہاں معمولی بات ہے کہیں کہیں یہ شعر بڑے پر اثر ہوتے ہیں ان میں بڑی شان و شوکت بڑی بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ قصہ سے علیحدہ اپنی جگہ بھی کر لیتے ہیں، اور ذہن پر ایک نقش بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں نہ

خیال بہت بلند ہوتا ہے نہ بہت گہرا، مگر بڑے جوش سے بیان ہوتا ہے اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ حشر کے یہاں شکسپیر سے زیادہ مارلو سے مشابہت ملتی ہے مارلو Marlowe کے متعلق تمام نقادوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ دراصل شاعر تھا جو ڈرامہ کی سرحد میں آوارانہ گھس آیا تھا، واقعات اور ماحول میں وہ بند بند اور کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ مگر جہاں اسے اپنے تخیل کی لامحدود فضائیں جاتی ہیں وہاں وہ انسانوں کے جذبات میں دیوزادوں کی دھڑکن اور معمولی واقعات میں زمین و آسمان کی ہل چل کا سماں دکھا سکتا تھا۔ مارلو کے عظیم الشان مصرعوں MIGHTHY LINES کا جواب شکسپیر کے یہاں بھی نہیں ہے اس کے مشہور ڈراموں TAMOERAINE - FAUSTV اور EDWARDV میں بعض حصے ایسے ہیں کہ ان پر انگریزی ادب اب بھی فخر کر سکتا ہے اس سے پہلے بے قافیہ نظم بے جان اور بے روح تھی۔ اس نے اپنی آتش نفسی سے اسے بجلی اور تلوار بنا دیا۔ اس میں ضبط و نظم بالکل نہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ نثر لکھنے پر بالکل قادر نہ تھا۔ اس میں تعمیری صلاحیت بھی بہت کم تھی اس کے ڈرامے دراصل جذبات کا سیلاب اور خیالات کا ہنگامہ ہوتے تھے اس کی اخلاقی میں کلام نہیں، مگر وہ صرف ہنگامہ میں کام آتی تھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مارلو کم عمری میں مر گیا۔ اسے شباب کے بدلے موت ہی آئی۔ حشر کو اپنی پچھلی کمزوریوں کو جانچنے اور ان سے بچنے کا موقعہ ملا۔ مارلو زندہ ہوتا تو شاید شکسپیر دو ہوتے یا ممکن ہے دو مارلو ہوتے کیونکہ خود شکسپیر نے مارلو کی عرصے تک تقلید کی ہے۔ حشر نے آخر میں گو دو بیش کے اثرات قبول کئے مگر وہ اچھی نثر لکھنے پر مشکل سے قادر ہو سکے ان کے یہاں وہی ناتراشیدہ ایک طرف پارسی کمپنیاں منشیوں اور پنڈتوں سے ناٹک لکھوا کر پبلک

کی تسکین کا سامان بہم پہنچا رہی تھیں۔ دوسری طرف ہمارے بعض ادیبوں کو بھی ڈراموں کے امکانات اور وسعتوں کا احساس ہو رہا تھا، اور وہ بھی ملتو فید سہی اس طرف توجہ ضرور کر رہے تھے، ان میں اسٹیج کرنے کے قابل ڈرامے کم ہیں، مگر پڑھنے کے لئے دل چسپی کا سامان موجود ہے، شوق اور رسوا نے ڈراما کی زبان میں اصلاح کی اور اگرچہ فن کی نزاکتوں کا اچھی طرح احساس نہ تھا مگر پھر بھی اس کی جامہ زیبی کا حق انہوں نے ادا کیا۔ حشر کے یہاں بھی اس زمانے میں یہ جامہ زیبی ملتی ہے جو ادبی چاشنی کی وجہ سے ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اوروں سے زیادہ ہے ان کے یہاں اچھے اشعار مل جاتے ہیں پرزور مکالمے ہیں مقفیٰ ہی سہی پھر بھی اثر کرتے ہیں کہیں کہیں نفسانی اشارے ہیں مگر عام طور پر فنی کمزوریاں بکثرت ہیں، دوہرے دوہرے پلاٹ کا تک شیطان کی آنت کی طرح لمبا، پست اور ادنیٰ درجہ کا مذاق، نظم کا عنصر نثر سے بہت زیادہ، جا بجا خطابت یا رجز خوانی یہ ہے حشر کی کل کائنات۔ اس وقت تک وہ نئے اصلاحی اور جمہوری نقطہ نظر سے متاثر نہیں ہوتے، مگر ان کے اشعار پڑھ کر ا ے HPOL (ا ے TELBRANCH) کا خیال آ ہی جاتا ہے۔

پھر کا برسات میں جن ندی نالوں میں روانی ہے
انہیں گرمی میں دیکھو تو نہ موجیں ہیں نہ پانی ہے
عطر کی مٹی تل کر بھی مہک جاتی نہیں
توڑ کر بھی ڈالو تو ہیرے کی چمک جاتی نہیں
انسان اور انسان کے دکھ سکھ کی پہیلی
اک راز ہے اور حشر تک راز رہے گی

آب دریا میں سر ورِ جام ٹل ہوتا نہیں
خار کا گل نام رکھ دینے سے گل ہوتا نہیں

ہمارے یہاں ہر دور بہت جلد بدل جاتا ہے، پھل ابھی آب و رنگ نہیں لانے پاتا کہ دھوپ کی تیزی اسے وقت سے پہلے پکا دیتی ہے۔ ناٹک کا فن ابھی اوپری ترقی کر پاتا تھا۔ اس میں گہرائی واقفیت، نزاکت اور لطافت نہ آنے پائی تھی کہ فلم کو ترقی پائی تھی کہ فلم کی ترقی نے اس کی بڑھو تری پر برا اثر کیا دوسرے لکھنے والوں کی طرح حشر بھی فلم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس تبدیلی کا اثر دو چیزوں پر خاص طور پر سے ہوا۔ ایک تو حشر نے اپنے موضوع بدلے، شیکسپیر کی جگہ ابسن (IBSEN) نے لے لی۔ جذباتی داستان کے بجائے اجتماعی مسائل اہم قرار پائے۔ اصلاحی۔ معاشرتی، قومی اور اخلاقی فلم تیار ہوئے دوسرے اُردوِ معلّیٰ کی جگہ ہندی ہندوستانی آئی، حشر بھی تجارتی نقطۂ نظر سے کیسے بچ سکتے تھے، انہوں نے ہندی میں ناٹک تیار کئے اور اُردو کے ناٹکوں کی زبان ہندی آمیز کر دی، یہ زبان ان کی پچھلی زبان سے زیادہ آسان اور عام فہم ہے، بلوا منگل میں ایک شوقین آدمی کو اپنی بیوی کی محبت اس طرح یاد دلائی جاتی ہے۔ یہ بھارت کی ہندو لڑکی جس کی جاتی میں پرماتما نے شکنتلا کی خوبصورتی سنتیا کا پتی برت دھرم اور رادھا کا پریم جمع کر دیا ہے، اس کے لئے محبت کا برتاؤ اور اپنے واسطے آگیا کاری سوبھاؤ "عورت کا پیار اور آنکھ کا نشہ" معمولی نظم سہی، مگر دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

حشر ڈرامے لکھنے میں اس قدر مصروف ہوئے کہ وہ شاعری کی طرف پوری توجہ نہ کر سکے پھر بھی یہ صحیح ہے کہ ڈراموں میں انہیں اپنی شاعرانہ قدرت

کی جھلک دکھانے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ مگر شکر یہ لیوریپ اور موج زمزم کا لکھنے والا اول درجے کا شاعر نہ سہی اچھا شاعر ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حشر کے لکھے ہوئے ڈرامے قدیم طرز کے دوسرے دوسرے ڈراموں کے فنی معیار سے لگ بھگ ہوتے کے باوجود زیادہ دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے خاصی زندگی پائی اور خاص ڈرامے لکھے۔ ان میں ترقی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ چلے تھے قدیم داستانوں اور انگریزی پلاٹ پر نمک مرچ لگا کر چٹخارہ پیدا کرنے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ڈراما محض تفریحی نہیں رہا تھا۔ بلکہ سنجیدہ اور مہذب ہو گیا تھا۔ آسمان پر بے معنی پرواز سے اکتا کر وہ زمین پر اتر آیا تھا اور اس دنیا کے مسائل کو پیش کرنا اس کا شعار ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں کو حسن و عاشق کے نشہ اور جنگ و خونریزی کے ہنگامے سے بہلانے کے بجائے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سوالیہ نشان بنا کر ان کی طرف دھیان دلانا اسے آ گیا تھا۔ اسکی بولی بھی سہل ہو گئی تھی اور اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ یہ سب تبدیلیاں صرف حشر کی کوششوں سے نہیں ہوئیں۔ مگر حشر کی مدد سے بھی ہوئیں۔ انہوں نے ڈرامے کو زیادہ ،،رودار،، یا ہمارے ہاں کی بولی میں زیادہ ،،دیدار،، بنا دیا مگر اسے بہت بلندی پر نہ پہنچا سکے۔ شکسپیر اپنی منزل آپ ہے، وہ ڈرامہ کے فن میں شان راہ کی نہیں تنہائے راہ کی حیثیت رکھتا ہے، حشر دراصل سنگ راہ ہیں وہ زمانے کے ساتھ بدلتے رہے اور اس طرح وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک کڑی ہیں، انہوں نے نظم کی بھرمار کو کم کیا، قافیہ سلیقہ سے برتا۔ گانوں کی تعداد گھٹا کر چند منٹ تک گانے آئے LOGYR اور ASIDE اور ایک سے کام لیا وہ ملک میں تجربے کئے قصہ عام فہم اور سادہ رکھا اسٹیج کی دشواریوں کا لحاظ کیا۔ بلند آہنگ مکالمے تصنیف کئے مگر کردار نگاری

یں کمال نہ کر سکے انہوں نے ایک بھی غیر فانی کردار زندگی کو نہ دیا۔ ان کے المیہ ختم تو ٹھیک ہوتے ہیں، مگر ان میں وہ بات نہیں آنے پاتی جو جگر کے اس شعر میں ہے۔ اور جو المیہ کی بلندی کی طرف بڑی خوبی سے اشارہ کرتی ہے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں آتی

اس کی ایک جھلک ہمیں آگے چل کر تاج کی اتار کلی میں مل جاتی ہے جس میں المیہ کے اصولوں کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔



سمندر پار سے سرسید احمد کے خط

سرسید اپنی عمر میں صرف ایک مرتبہ ہندوستان سے باہر گئے۔ اس وقت ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ اس عمر میں لوگ عام طور پر دنیا کو چھوڑ کر خدا کی یاد میں دن بسر کرتے ہیں یا کعبہ دیکھنے جاتے ہیں۔ سرسید خدا کی شان دیکھنے انگلستان گئے، انہیں لکھنے پڑھنے سے جو دلچسپی تھی وہ ان کا مزاج بن چکی تھی ان کی کتابیں مشہور ہو چکیں تھیں۔ ان کی قومی ہمدردی اور دل سوزی کا چرچا ہونے لگا تھا حکومت ان کی عزت کرتی تھی اور ان کی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتی تھی سائنٹفک سوسائٹی قائم ہو چکی تھی۔ گزٹ جاری ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی۔ ہندوستانی خصوصاً مسلمانوں کی پستی پر آنسو بہاتے رہنے کے بجائے سرسید احمد اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے قریب لایا جائے تاکہ دونوں کی تہذیب و تمدن کو ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا موقع ملے اس مطلب کے لئے قربانی کے ایک بکرے کی ضرورت تھی، سرسید نے اپنے آپ کو پیش کیا اور حاکم و محکوم کے ربط و ضبط کو ترقی

دینے کے لیے خود بھی یورپ کا سفر کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دلائی۔

اگرچہ اس زمانہ میں کچھ ہندوستانی یورپ کو سفر کرنے لگے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی اور مسلمان تو عام طور پر مولوی مملوک علی کی طرح فرنگی کے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا ہاتھ علیحدہ رکھنا ہی پسند کرتے تھے۔

سمندر پار سفر کا تو خیال میں بھی نہیں آیا تھا سے دے کر سمندر کے معنی حج کے رہ گئے تھے۔

سرسید کے صاحبزادے "سید محمود" کو سرکار کی طرف سے وظیفہ ملا دیکھنے کو بھیلے کا بہانہ خود بھی قرض لے کر انہیں بھیج، دونوں لڑکوں اور مرزا احمد اداد بیگ کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

جیسا کہ سرسید نے اپنی چھٹی کی درخواست میں لکھا تھا وہ انگلستان کی سیر و تفریح کی غرض سے نہیں جا رہے تھے، بلکہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نمونے، اور اس کی ترقی کو بچشم خود دیکھنے اور اس بات کا اندازہ کرنے جا رہے تھے کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند اور طاقت ور اور دانا ہیں، وہ انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کرنا چاہتے تھے انہیں یہ یقین تھا کہ ان کا یہ اقدام ہندوستانیوں کے حق مفید ہو گا ان کا ارادہ انگلستان جا کر سر ولیم میور کی کتاب لائف آف دی پرافٹ (LIFE OF THE RROPHET) کا جواب شائع کرانے کا تھا تاکہ انگریزوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ رفع ہوں بقول محسن الملک کے اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے"۔

انہوں نے اپنے سفر کے حالات ایک سفرنامے کی صورت میں مسافران لندن کے عنوان سے سوسائٹی کے گزٹ کو بھیجنے شروع کئے تھے مگر چند مضمون نکل پائے تھے

کہ ان پر اعتراضوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ناچار سلسلہ ملتوی ہوا، اس کے علاوہ محسن الملک کے نام جو خط لکھے گئے تھے، ان میں بھی لندن کی زندگی اور وہاں سے عام حالات اور اپنی مصروفیتوں کا بہت کچھ بیان ہے، سمتد رپار کے خطوط کی یہی کل کائنات ہے جو ہمیں سرسید کے یہاں ملتی ہے، ان سے سرسید کی سیرت و شخصیت کے متعلق کوئی نئی بات ہمیں نہیں معلوم ہوتی، البتہ ان کے خلوص ان کی ہمدردی اور ان کی عظمت کا نقش اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

سرسید کی شخصیت سادہ سپاٹ ہے ان کے یہاں ایک ہی رنگ ہے مگر بہت گہرا، وہ قوم کی یاد لے کر انگلستان گئے تھے، اس عینک سے ہر چیز کو دیکھتے تھے بمبئی میں پارسیوں کی خوشحالی انہیں مسلمانوں کی پستی کی یاد دلاتی تھی۔

گجراتی جاننے والے سے وہ گجراتی میں اردو الفاظ کی کثرت کے متعلق گفتگو کرتے تھے، انگریز افسران سے تبادلۂ خیالات میں مطلق العنانی حکومت کو برا کہتے تھے اور ہندوستان میں اصلاحات چاہتے تھے۔

مصر کی رونق انہیں دہلی کے چاوڑی بازار کی یاد دلاتی تھی۔ مارسیلز کی روشنی ہندوستان کی دیوالی کو نہ بھلا سکتی تھی، پیرس اور وارسائی کے محلوں میں بیٹھ کر تاج محل اور قطب صاحب کی لاٹ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔

کبھی نہر سوئز کے بانی لیپ کے الفاظ کو اس نہر کا نام نہر فرانس رکھا جائے ان کی قومی حمیت کو ابھارتے کبھی گیری بالڈی کے وطن سے رات کو گذر جائے اور اسے دیکھ نہ سکتے تھے پر افسوس کرتے تھے۔

انگلستان پہنچ کر سید کی بڑی خاطر ہوئی بلکہ اس زمانے کے حسابوں معراج ہوئی، وزیروں اور امیروں نے ان سے ہاتھ ملائے محمد مدبین ان سے ملنے آتے انہیں علمی مجلسوں کا رکن بنایا گیا۔ دعوتوں میں شریک لیا گیا، اخباروں میں تعریفیں

چھپیں، تمغے ملے، دربار دیکھا، ملکہ سے ملاقات کی انیسویں صدی کے آخر میں ایک ہندوستانی کا تصور آخر کہاں تک جاتا ہے مگر یہ محض اس وجہ سے نہیں ہوا تھا کہ سرسید وفادار تھے، بلکہ یہ ان کی قابلیت اور مذہبی معلومات کا اعتراف تھا سرسید اس خاطر مدارات سے خوش ہوتے ہیں اور اپنے دوست محسن الملک کو اسٹار آف انڈیا کے تمغے کے ملنے کی یوں اطلاع کرتے ہیں۔

"مجھ کو یقین ہے کہ اس امر سے آپ زیادہ خوش ہوں گے اس لئے کہ باقی اصحاب کو عقل ذرا کم ہے مگر ان خطوں میں جذبہ محبت کی افراط نہیں عبرت وحیرت زیادہ ہے وہ یورپ کی علمی ترقیوں اور علمی کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تو اسطرح کہ ہندوستان والے اس سے سبق لیں۔ کتب خانہ انڈیا آفس کے متعلق کہتے ہیں کتب خانہ نہیں کتابوں کا شہر ہے۔ برٹش میوزیم ایک بڑا جنگل ہے کتابوں کا۔

انگلستان کے حسن سے وہ متاثر ہوتے ہیں مگر ایک لمحہ کے لئے انہیں اس کے بعد اپنی درمندی یاد آتی ہے جنت ہے۔ اور حوروں کا ہونا سچ ہے مگر ان کی قسمت میں دبی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک کی پستی کا غم اور بڑھ گیا ہے، سرسید احمد اندھیرے میں سے ایک ساتھ روشنی میں آئے تھے۔ آج ہم نہ اس اندھیرے کا اچھی طرح تصور کر سکتے ہیں اور نہ اس روشنی کا، انگلستان میں انہیں ذرا ذرا سی بات حیرت میں ڈالتی تھی۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کی مالکہ کی شرافت کا نقش ان کے دل پر بہت گہرا ہوا تھا، اس زمانہ میں یہ تجربہ بھی ہوا ہے کہ عورتیں سخت لالچی خود غرض اور تنگ نظر ہوتی ہیں۔

ان کے سونے کے کمرے میں جو ساز و سامان تھا وہ انہوں نے ہندوستان میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی خدمت کیلئے جو عورتیں مقرر تھیں ان کی تہذیب صفائی

سلیقہ شعاری ان کی نظروں میں بس گئی تھی۔ ایک طویل خط میں جو ۱۵ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کے گزٹ میں چھپا ہے، انہوں نے چھ مہینے کے لندن کے قیام کے تاثرات بیان کئے ہیں۔ اس میں اپنی خادمہ کے سلیقہ اور صفائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر یہ عورت جو نہایت غریب آدمی اور اصل گری کا محتاج اور دن رات ہماری خدمات پر حاضر رہتی ہے۔

اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمیوں کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان کی نفرت کرے۔"

پہلے وہ بھی اس خیال سے چڑتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں، مگر انگلستان کی خوش حالی اور فارغ البالی اور ظاہری ترقی دیکھ کر یہاں تک اتر آئے تھے کہ محسن الملک کو ایک خط میں یہ لکھنے سے بھی باز نہ رہے کہ انگریزوں کو ہندوستانیوں سے وہ نسبت ہے جو خوبصورت آدمی کو ایک وحشی جانور سے ہے۔ انہیں تمام دینی دنیوی خوبیاں یورپ بالخصوص انگلستان میں نظر آتی تھیں ان کا ذکر کرتے تھے اور اپنے ملک کی حالت پر افسوس کرتے تھے اس افسوس میں ان کے دل سے وہ چیزیں بھی محو ہو جاتی تھیں جو ہندوستان کے لئے مایہ ناز تھیں۔ اس جذبہ کا اثر تھا کہ سید محمود اپنے آپ کو ایک دفعہ ہندوستانی کہنے سے بھی شرمائے تھے۔

سرسید نے صرف انگلستان کو دیکھا تھا۔ اگر انہیں جرمنی، اٹلی، فرانس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملتا تو نہ معلوم ان کی کیا حالت ہوتی۔

یہ ضرور ہے کہ جس انگلستان کو انہوں نے دیکھا تھا وہ اپنی دولت عظمت اور فارغ البالی کی وجہ سے اپنے شباب پر تھا۔

سرسید کو ان کے زمانہ میں لوگ کافر کرسٹان، ملحد اور نیچری سب کچھ

کہتے تھے مگر تھے وہ مذہبی آدمی وہ یورپ کے کتب خانوں میں اپنے مذہب کی فوقیت کے دلائل تلاش کرنے اور یورپ کے مورخوں کا جواب دینے گئے تھے۔ یورپ کو انہوں نے صرف درباروں، محلوں، جنگی جہازوں اور بازاروں میں نہیں دیکھا کتابوں، کالجوں اور انجمنوں میں بھی دیکھا۔ انہوں نے محسن الملک کو شبلی کی اس دریافت سے پہلے اطلاع دی کہ کتب خانہ اسکندریہ عربوں نے نہیں بلکہ جولیس سیزر نے جلایا۔ ان کا بیشتر وقت یورپ میں سیور کی کتاب کا جواب تیار کرنے میں گذرا۔ انہوں نے خود ہی کتابیں نہیں لکھیں دوسروں کی کتابیں چھپوائیں بھی۔ ان کے خطوط میں بجائے سیر و تفریح کے ذکر کے جابجا کام کی کثرت کا ذکر ملتا ہے یا کام کی تیاری کا۔

انہوں نے انگلستان میں سترہ مہینے قیام کیا اس عرصہ میں انہوں نے انگلستان کے تعلیمی اداروں خصوصاً کیمبرج کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور ایک خط میں وہاں کا حال لکھا ہے کیمبرج سے جو آرزو وہ لے کر آئے تھے وہ بعد میں علی گڈھ کالج کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

ان کے قیام یورپ کا یہ زمانہ اور بھی کئی باتوں کی وجہ سے یادگار ہے یہیں انہیں ایک رسالہ جاری کرنے کا خیال ہوا جس کا مقصد حیوانوں کو انسان بنانا تھا اور جو تہذیب الاخلاق کے نام سے ۱۸۷۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ بقول حالی کے اس کا ایک بلاک وہ انگلستان ہی سے بنوا کے لائے تھے۔ خطبات احمدیہ کا سارا مواد یہاں تیار ہوا۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا ان کا سیاسی نقطۂ نظر بھی اسی زمانہ کی پیداوار ہے، اور ان خطوں سے ان سب باتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

جس عمر میں جس مشن کو لے کر سر سید انگلستان گئے تھے ان کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں ان خطوں میں بہت زیادہ دلچسپ باتیں نہیں ملتیں ان میں تفصیلات تو کافی ہیں

مگر اب یہ قصہ پارینہ ہو گئی ہیں۔ جہاز کیسے چلتا ہے اس کا رخ کس طرح بدلا جاتا ہے اس میں عملہ کتنا ہوتا ہے، انگلستان میں قابل دید مقامات کون کون سے ہیں۔ وہاں کے رہنے سہنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں سرسید کے یہاں ملتی ہیں اب بدل گئی ہیں۔ سرسید نے جب انگلستان کو دیکھا تھا تو عہد وکٹوریہ کی فارغ البالی ظاہری شان و شوکت متانت، سنجیدگی مذہبیت کچھ اور تھی بیسوی صدی کے انگلستان کی حالت اب کچھ اور ہے۔ خود سرسید کی شخصیت میں ایسے پہلو نہیں ہیں، نہ بہت بلندی ہے نہ بہت پستی ایک یکسانیت ہے یہی باتیں ان کے خطوں میں بھی مگر ان کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے یہ راز دار نہیں کچھ کا ہے مگر اس میں بڑے بڑے مسائل کو باتوں باتوں میں بیان کرنے کا ڈھب ضرور ہے۔

اٹلی اور سسلی کے درمیان ان کا جہاز گذر رہا تھا تو انہیں ایسا محسوس ہوا گویا ہم ہاتھ پھیلا کر ایک اٹلی کے اور دوسرا سسلی کے کنارے رکھ دیں گے انہوں نے یورپ کی ترقی دیکھ کر ہندوستانیوں کو کچھ جلی کٹی سنائیں جن پر یہاں پر بڑا شور مچا تھا سوسائٹی کے سکریٹری کو لکھتے ہیں۔ مادر زاد اندھا آپ کی دانست میں سورج کی روشنی کی کیفیت یا چاندنی کی خوشحالی کی فرحت سمجھ سکتا ہے یا خیال میں لا سکتا ہے۔ مگر مخالفت کا اثر سب پر ہوتا ہے! چنانچہ ان خطوں میں اس کا اثر بھی کافی ہے۔ چنانچہ وہ ان لوگوں پر جھنجھلاتے ہیں جو مروڑی ہوئی مرغی کھانے یا انگریزوں سے ملنے کی وجہ سے انہیں کافر قرار دیتے ہیں! آخر انہیں تسلی ہو جاتی ہے کہ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔

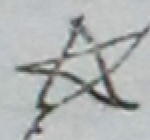
سرسید علوم مشرقیہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ مگر فاضل نہ تھے انگریزی تو اچھی طرح سمجھتے بھی نہ تھے اور بولتے بہت کم تھے چنانچہ اپنے خطوں میں ایک جگہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ (زبیر ہند کو انگریزی میں جواب دے سکے اگرچہ میر

انگریزی بالکل نیاز مندانہ تھی۔ اس وجہ سے یہ خط باوجود صاف اور سادہ ہونے کے کچھ دھندلے دھندلے سے ہیں ان سے سرسید کے تعلیمی و سیاسی مشن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی۔ انگلستان کو سمجھنے میں یہ بہت معاون ثابت ہو سکیں وہ انگلستان ایک ہونہار شاگرد کی حیثیت سے گئے تھے اور اپنی زندگی کے بڑے حصے میں وہ یورپ کے ایک ہونہار شاگرد سے آگے نہ بڑھ سکے اس سے ان کی عظمت کم نہیں ہوتی مگر اس کی ذہنیت واضح ہو جاتی ہے۔ اکبر نے اسی ذہنیت کا مذاق اڑایا ہے۔

حاضر ہوا میں حضرت سید میں ایک رات   افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے   میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی   بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر   یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا



(۱۹۴۱ء)

مکاتیب مہدی

"خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

زد حاضر کے دو ادیبوں پر صادق آتا ہے، ایک سجاد انصاری دوسرے مہدی افادی۔ ایک میں شان جلالی تھی۔ دوسرے میں شان جمالی، وہ اپنی آگ میں خود جل کر مر گیا۔ ان کی لطافت طبع ایک طویل بیماری کی گران باریوں کی متحمل نہ ہو سکی دونوں بہت مشہور نہیں، عوام شاید ان کا نام بھی نہیں جانتے، دونوں بڑے اونچے پائے کے ادیب تھے مگر دونوں کا پیشہ کچھ اور تھا! سجاد وکیل تھے مہدی تحصیلداری کے کاموں اور کاغذات پٹواری کی جانچ میں سر کھپانے والا ادبی دلچسپیوں کیلئے بھی وقت نکال لیتا تھا، کسی نے کہا ہے کہ جو میری جمالین سے میری رشتہ دارازلی ہے مہدی کا بھی مقولہ تھا وہ حسن کے سچے پرستار تھے کوئی اچھی کتاب اچھی طرح چھپ کر آتی تو عروس جمیل و لباس حریر کہہ کر خطاب کرتے۔

ان کی کتابیں ان کی نازنینان حرم تھیں۔ جہاں وہ اپنی فرصت کے سارے اوقات صرف کرتے پڑھتے زیادہ لکھتے کم اور لکھتے بھی تو زیادہ تر خط لکھتے

یہ خط دوست احباب کے نام بھی ہوتے اور اخبارات و رسائل وغیرہ کیلئے کبھی کچھ مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے یہ سب افادات مہدی کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں، اب خطوط "مکاتیب مہدی" کے نام سے چھپے ہیں، تین سو صفحے جامعہ سائز قیمت ۸ عہ/ اور مہدی بیگم سے نسبت پور کے پتہ سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

افادات مہدی کہنے کو چند متفرق مضامین کا مجموعہ منتشر سے خیالات بکھرے ہوئے موتیوں کے مانند، مگر باتوں باتوں میں مہدی افادی بڑے بڑے مسائل پر تنقید کا حق ادا کر دیئے ہیں، کتاب ادب و انشاء کا چمن بھی ہے، اور نقد و نظر کا معیار بھی مشرقی و مغربی تمدن کے ٹکراتے سے ایک شرر پیدا ہوا تھا جس میں دونوں کے اجزا ملے جلے تھے، افسوس ہے کہ یہ شرر شعلہ نہ بن سکا اور وقت سے پہلے بجھ گیا۔

مہدی کی بالغ نظری اور پر لطف انداز بیان کے بڑے بڑے قائل تھے شبلی جیسا اونچا آدمی جو اپنا معیار تنقید بھی اونچا رکھتا تھا اور معاصرین میں سے کم کو خاطر میں لاتا تھا ایک جگہ کہنے پر مجبور ہو گیا، مضمون دیکھا نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد، آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے کئی دن دیکھنا اور احباب کو دکھاتا رہا۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کاش شعر العجم کے مؤلف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے بھی نصیب ہوتے، نثر والی کو ان کے اندر سنگ تراشوں کی سی نزاکت اور مصوری کی نظر آتی ہے، یہ سب ان خطوط میں بھی پورے طور سے جلوہ گر ہیں۔

مہدی کا حلقہ ادب بہت بڑا تھا، مگر پھر بھی اس میں ان سے کئی اچھے ادیب اور صاحب ذوق موجود تھے، اس مجموعہ میں شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی عبدالماجد وحید آبادی پروفیسر عبدالباری، ہوش بلگرامی، رصلہ ضی خیرآبادی، میر شبیر علی۔ صدائے عام و اسلام اور بعض دیگر احباب کے نام خطوط

موجود ہیں۔

شبلی کو انہوں نے بہت سے خط لکھے تھے اور بہت جی لگا کر مگر افسوس ہے کہ باوجود ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے شبلی نے مہدی کے خطوط محفوظ نہ رکھے، صرف تین خط اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

سید سلیمان ندوی عبدالماجد دریا آبادی اور پروفیسر عبدالباری کو مہدی نے بہت سے خط لکھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب سب محفوظ رکھے گئے۔

ان خطوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا ادب کا ذوق فطرت کی طرف سے لے کر آیا تھا اور بہت سے پیشہ ور ادیبوں اور نثاروں سے بہتر لکھنے والا تھا سید سلیمان ندوی نے ٹھیک لکھا ہے کہ انکا قلم باغ و بہار تھا بلا کی شوخی اور شگفتہ طبیعت پائی تھی، اچھے خاصے خشک فلسفیانہ مباحث میں وہ اپنے طرز بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے تھے بڑے بڑے مولویوں کی تقدس آب بارگاہوں میں وہ ادب لطیف کی شمع روشن کرتے جس طرح لبریز ساغر سے شراب چھلکتی جاتی ہے اسی طرح انکی طبیعت کی رنگینی الفاظ میں بکھری رہتی ہے۔

خطوط نثر کے دوسرے اصناف سے ذرا مختلف ہیں کتاب سب کیلئے لکھی جاتی ہے خط صرف ایک ہی کیلئے، کتابوں میں جان ہوتی ہے ادھر چھپیں ادھر زمانے کی زد سے محفوظ ہو گئیں لیکن خطوں کے لکھنے وقت اگر اشاعت کا خیال ہو تو ان کی ساری نزاکت و لطافت جاتی رہتی ہے ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ بے تکلف خطوط ہوں، دلی جذبہ کا آئینہ ہوں، ان میں تصنع کا شائبہ نہ ہو لکھنے والے کے چہرے پر نقاب نہ ہو، مکتوب نویس کا آرٹ کیا ہے۔

صرف فطری ہونا، جہاں بناوٹ آئی، خط نہ رہا، مضمون ہو گیا، اچھا خط وہ نہیں ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے جا ئیں بلکہ اچھا وہ

خط ہے جسمیں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور جس میں اس کی سیرت کا عکس بھی، غالب، اس گر سے واقف تھے جبھی تو وہ زبان قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں وصال کے مزے لیتے سو کیفیٹ بھی اس راز کو سمجھتا تھا اسٹیلام کے نام جو خط ہیں ان میں انگلستان کا یہ سنجیدہ مزاح نگار اور بے مثل طنز نگار بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتا نظر آتا ہے، سوئفٹ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ان خطوط کو نظر انداز نہیں کر سکتا، یہی ان کی قدر و قیمت ہے اسطرح جو حضرات مہدی افادی کے خطوط کا مطالعہ کریں گے انہیں ایک دلچسپ شخصیت ملے گی جسمیں ایک خاص شان ہے مہدی کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ تھا، دوم درجے کی چیز ان کی نظر ہی میں نہ آتی تھی، خیال میں بلا کی رعنائی تھی اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے الفاظ دلہن معلوم ہوتے تھے لفاست و لطافت کو انھوں نے اپنی زندگی کا جز و بنا لیا تھا، وہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن کتابوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ سب ادبی خطوط ہیں اکثر ادیبوں اور ادب جاننے والوں کے نام ہیں انکے جو دوست ہیں وہ بھی اس شراب کے مست معلوم ہوتے ہیں ان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں کم ہیں، ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نہیں گزرا جس چیز کو ڈرامائی کہا جا سکتا ہے وہ ان کے یہاں مفقود تھی، پہلی بیوی زندگی کے دوپہر ڈھلتے وقت داغ مفارقت دے گئیں ان کی یاد میں لکھتے ہیں ؎

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گی　　　ترا داغ دل میں نشانی رہیگا

کچھ دنوں بعد دوسری شادی کی، خوش قسمتی سے بیوی نہایت اچھی ملیں حسن سیرت اور صورت دونوں سے مرصع اولاد بھی نہایت صالح، غرض زندگی اچھی طرح گذرتی تھی مگر آدمی بڑے حساس تھے ایسے کتنے لوگ ہیں جو تحصیلدار ہو جائیں تو گاڑی کی زمین پر پاؤں نہ رکھیں یہ بے چارے تحصیلدار ہونے پر شرماتے تھے

نئی کتابوں کے نکلنے کا انتظار، مطبوعات کا مطالعہ دوستوں سے خط و کتابت یہی ان کی زندگی کے محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔

مہدی کے خطوں میں مکاتیب کی سب سے بڑی خصوصیات سب سے زیادہ نمایاں ہے یہ ان کی زندگی کی پوری پوری تصویریں ہیں جو شخصیت ان کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے وہ کتابی نہیں۔ ان کی زندگی کی تمام خصوصیات کی حامل ہے دوسری خصوصیت میں شبہ ہے، یہ خطوط بے ساختہ اور بے تکلف خطوط نہیں مہدی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مہدی کو خط لکھنے کا شوق تھا وہ اپنے طرز کی خوبیوں سے واقف !

ایک صاحبہ کی زبان سے کہتے ہیں۔

ایک صاحبہ پاس بیٹھی ہیں، اس خط کو دیکھ کر فرماتی ہیں۔

تم سرسری خط میں جو کچھ لکھ دیتے ہو، بڑے مضمون میں اس کی سمائی نہیں ہو سکتی، کیا یہ سچ ہے

"مقیاس الشباب کی آپ کو داد دینی ہو گی نور جہاں کے ذکر کے ساتھ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا خیال نہ آتا جسے مغربی شعراء بہترین حلیۂ فطرت کہتے ہیں یہاں نے اس موقع پر دفینۂ حسن کے لیے مقیاس الشباب لکھا ہے اور خاص میری من گھڑت ہے آپ دیکھیں گے کہ متانت میں کس قدر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور گو یا نہیں کہہ سکتا کہ اس ترکیب پر مجھے ناز ہے، تاہم لذت احساس سفارشی ہے کہ ابھی سوچی آپ کی کیا رائے ہے۔ کہیں اس سے میرے مذاق خاص کی غمازی تو نہیں ہوتی ہے آپ کی نگاہ میں ذرا ثقہ رہنا چاہتا ہوں۔"

تیسری خصوصیت ان کے خطوط کی یہی ہے جو آخری جملہ میں بیان ہوئی
یعنی مولوی کے سامنے رند اور رندوں کے سامنے مقطع بنکر
آتے تھے۔ کسی نوجوان شاعر نے اپنی محبوبہ کی اس طرح تعریف کی ہے
کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی کبھی اس کی سنجیدگی میں شوخی
یہی بات ان خطوط میں ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مباحث میں وہ ایسی ایسی
باتیں لے آتے ہیں جو عریاں معلوم ہوتی ہیں۔
مگر ان کی عریانی در لالہ و گل کے پردے میں رہتی ہے خوبصورت الفاظ کا
پیکر دے کر وہ اپنے خیالات کو حسین بنا لیتے ہیں۔
اپنے ثقہ دوستوں کو ان کی مولویت پر چھیڑتے رہتے ہیں۔ ذرا یہ الفاظ
ملاحظہ ہوں شبلی کو لکھتے ہیں
"مدت کی تلاش کے بعد وہ جنس لطیف ہاتھ میں آئی جو آپ لوگوں کو دوسری
دنیا میں ملے گی۔
ایک اور صاحب کو لکھتے ہیں۔
"ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ دونوں صاحبوں کی مدرسیت میری سمجھ
میں نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے اور اس سے انشا پردازی
کی سنجیدگی پر استدلال ہو۔
یہی بزرگ نکاح کی شب اول بیمار تھے۔
انہیں لکھتے ہیں۔
جیسے بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاع میں شکن بستر نکلا
پھر فرماتے ہیں۔
"وہ آتشہ ابھی پکی ہوئی ہو تو نشاط ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے ہیں اس

نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں،،

نقاد کا نام ابھی شاید پڑھے آدمیوں کے متعلق ایک دوست کو لکھتے ہیں
نقاد میں مضامین کیا لکھوں۔ کتنا طوطا کو پڑھایا پر وہ حیوان
ہی رہا، ادبیت کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ پہلے ایک خانگی بیم پہنچائی
گئی تھی اب ڈنکے کی چوٹ ایک سرائے والی بیٹھ گئی ہے یعنی
زبان کی جگہ ایک شگفتہ کلی نے لے لی،، شاہ صاحب ''تصوف،،
کے دلدادہ لغزش مستانہ سہارا ڈھونڈتی ہے موقع ملا اور پھیلے۔

مولویوں کے سامنے رندانہ وضع اور رندوں کی محفل میں سنجیدگی کے
تیور، یہ عجیب و غریب اجتماع آپ کو مہدی کے یہاں ملے گا اسی سے ملتی جلتی
ایک اور چیز دیکھئے جو نہایت دلچسپ ہے اوپر میں لکھ چکا ہوں کہ مشرقی اور مغربی
تمدن کے ٹکراؤ سے یہ شرارہ پیدا ہوا تھا، ان کا دماغ مغربی تھا اور دل مشرقی
انگریزی اصطلاحوں کے لئے اردو مترادفات تلاش کرنے کی انہیں دھن تھی ڈھونڈ
کر الفاظ لاتے تھے اپنے دوستوں سے پوچھتے تھے، خود کاوش کرتے تھے
اور انصاف یہ ہے کہ بعض اچھے مترادفات ان کے یہاں ملتے۔

مغربی طرز رہائش کا دلدادہ، انگریزیت کی بو میں بسا ہوا مغربی
شائستگی و نفاست کا شیدا، سگریٹ کے لفظ کے لئے بھی ''وسائل دود کشی،،
استعمال کرتا ہے اس کے علاوہ ETIBUETTE کے لئے

''عوائد رسمیہ،، کلائمکس ''کے لئے لب العالیہ،، ہائی کرٹی سیزم کیلئے
''تنقید عالیہ،، ماسٹر پیس ''کے لئے اختراع فائقہ،، ان ڈفرنس،، کے لئے
بے رخی ''لب نروس'' کیلئے،، وظیفہ لب،، ہنی مون ''کیلئے'' عہد زناف
یہ سب ان کی ایجادات ہیں۔

اس کے علاوہ بعض ترکیبیں انھوں نے اچھی وضع کی ہیں غیر شائستہ جنبش لب، خمیازہ شباب، مضیاس الشباب، زہر شب، مجت کا طرادلیں ان سب سے حسن آفرینی معنی آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ اور تحریر چمک جاتی ہے۔

ان خطوط کی ادبی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ یہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز کے لکھے ہوئے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں ادبی مباحث کتابوں، رسالوں اور بہت سے ادیبوں پر اچھی خاصی تنقیدیں ملتی افادات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مہدی باتوں باتوں میں بڑے بڑے پتے کی کہہ جاتے ہیں یہی انداز یہاں بھی کارفرما ہے۔ مولانا ماجد نے ایک مضمون فلسفہ غالب کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر عبدالباری کو لکھتے ہیں۔

"جو رکھ رکھاؤ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے، ان میں اکثر نکات بعد الوقوع ہیں۔

میں نہیں کہتا کہ حکیمانہ صداقتیں ان کے کلام میں موجود نہیں سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ کیا شاعر بھی ہر جگہ اسی نقطہ سے واقف تھا۔ اس میں ذرا مجھکو کلام ہے۔

ریاض کے متعلق دلگیر کو لکھتے ہیں۔

مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں جلائے) عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر لٹے ہوئے ہیں وہ ریاض کے قلم کی آوارہ بازگشت ہے آج لٹریچر پر طبع آزمائی کے لئے بہتر اٹھ کھڑے ہوں گے، میں نے پہلے پہلی یہ تسلسل ہی دیکھا۔

جب اس کے مفہوم سے اچھی طرح واقف نہ تھا موجودہ لٹریچر ارتقائی حیثیت سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے۔ وہ جس طرح نظم کا مالک ہے، بقائے نثر بھی ہے اور بھی امتیازی نالف ہے جس کی بنا پر وہ انشا پردازی کی مسلم الثبوت ہیر دہے تاریخ آئندہ بتائے گی صفاوی میں ریاض کو کہاں جگہ دی جائے گی۔

اس قسم کے سینکڑوں اشارے ہیں جو خطوط میں بکھرے پڑے ہیں انہیں کہاں تک دکھاؤں، مگر یہ خیال رہے کہ خطوط میں مہدی صرف شبلی و خیام کے پرستار کی حیثیت سے نہیں، تحصیلدار کی حیثیت سے بھی رونق افروز ہیں اس کے علاوہ شوہر، باپ اور دوست کی حیثیت سے بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے ایک دوسرے دوست کو لکھتے ہیں۔

"تم شوق سے آؤ جم جم آؤ، ڈیکے کی جوٹ یعنی تو ندیر ہاتھ پھیرتے آؤ اور اپنی دلبر جوڑی یعنی شیخ کو بھی لاؤ۔ سمجھو یا نہ سمجھو مبر وطنیت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود ہے اونچی سے اونچی سوسائٹی میں بیٹھا بڑے بڑے جگمگاتے نظارے دیکھے عمر اسی میں گذری لیکن قسم لے لو اگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں بجلی کی ہوش ربا زیادہ روشنی میں بیٹھ کر کبھی کبھی اپنے سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا۔

ایک تحصیلدار جو اپنی بدقسمتی سے خوش مذاق بھی ہے اپنے حاکم ضلع کے استقبال کا سین کھینچتا ہے، کیمپ کی آرائشوں کے علاوہ ایک خاص چیز ملاحظہ ہو۔

شکار کے نہایت شوقین ہیں ایک روز معلوم ہوا صبح کے نکلے دو بجے واپس آئیں گے۔ یعنی چاشت نذار دنج پر کر نکالی جائے گی۔

دو لیڈیاں بھی ساتھ تھیں بجلی کی طرح خیال آیا جنگل میں ٹھیک
بارہ بجے ایک چپراسی سادہ لباس ایک چھوٹی سی میز پر ضروری
سامان آراستہ کر رہا ہے اور متوقع آمد کا انتظار کر رہا ہے کہ
دفعتاً شکاری ہاتھیوں پر نظر آئے جو باوجود کامیابی کے خستہ
ہو رہے تھے ہاتھی فوراً بٹھائے گئے اور سب کے سب مہمان ناخواندہ
کی طرح میز پر ڈٹ پڑے، داد کی داد تھی کہ میر قافلہ نے خود
کہا کہ تحصیلدار صاحب نے بھیجا ہے؟ چپراسی کا مودبانہ جواب یہ
تھا کہ عرض کرنے کی اجازت نہیں ہے (زور کا قہقہہ) واپس آئے تو
متلبانہ چہروں نے ظاہر کر دیا کہ بات کی پردہ دری ہو چکی اور ایک
خاتون کی جیتی لب شکریہ سے گرانبار نظر آئی۔ یہ میرا صلہ تھا۔
(غلطی نہ کیجئے گا ہر تحصیلدار کا نہیں۔)

غرض یہ خطوط ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ جب کبھی
گزشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو افادات اور مکاتیب
والے مہدی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی
کوشش اور کاوشیں کیا تھیں رسالوں کی قدر و ناقدری کے کیا مدارج تھے
ایک ادیب دوسرے ادیبوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا تھا۔ اسلوب میں کس
بات پر زور دیا جاتا تھا خیالات کی کون سی بلندی سر پر تھی کس دائرے
میں ہمارے ادیب گردش کرتے تھے، یہ سب ان خطوط سے آئینہ ہو جائیگا۔

طرز بیان کی شوخی مہدی کو زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہو گی ممکن
ہے کہ ادبیات میں جو نقطۂ نظر مہدی کا تھا وہ نہ رہے اور اسے رہنا بھی
نہ چاہیئے۔ اس لئے ادب میں قوت بڑھنے اور پھیلنے سے آتی ہے، یہ بھی ممکن

ہے کہ مہدی کی جو رائے بعض ادیبوں کے متعلق تھی وہ ہمیں بدلنی پڑے جنہیں وہ اول درجہ کا ادیب کہتے ہیں انہیں دوم درجہ میں بھی جگہ نہ ملے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا، وہ مستی ہے جو شراب انگور کی ممنون نہیں وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی ہے جس پر بانکپن نثار۔ تخصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں رہ کر بھی یہ صاحب ذوق حسن کا پرستار اور پجاری رہا شمع انجمن ہو یا چراغ خانہ جہاں روشنی تھی اسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کما حقہ نہ تھی وہاں بھی وہ اپنی حرارت عشق سے شعلہ روشن کر لیتا تھا۔ اس نے بقیے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی تھی بد مذاقوں کی اصلاح کی تھی بے راہ روؤں کو ٹوکا۔ وہ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی کافی ضمانت نہیں ہے۔



خنداں

(یعنی رشید احمد صدیقی کی کتاب "خنداں" پر ایک تبصرہ)

ایک شاعر کا قول ہے جہاں کوئی حسین صورت ہے۔ میری رشتہ دار ادیب شاعر تو حسن کا قدر داں ہے لیکن حسن اور بدصورتی۔ اخلاق اور بداخلاق خلوص اور ریاکاری۔ بلند و پست، سب سے دلچسپی رکھنے والا اور ہر سکوت کو ہنگامہ اور ہر ہنگامہ کو سکوت بناتے والا طنز نگار اور مزاح نگار کے سوا کوئی نہیں۔ وہ کبھی تو زندگی کی کھردری کسیلی باتوں میں شہد کی شیرینی پیدا کرتا ہے، کبھی شیریں اور خوش آہنگ نغموں میں زہر کی تاثیر بھر دیتا ہے، وہ کتوں کے شور میں مشاعرے کے آداب اور راہبر کے کھیت میں ہائیڈ پارک کے نظارے دیکھتا ہے۔ روزمرہ واقعات کے جلوے بے رنگ میں قوس و قزح کی دھاریاں پیدا کرتا اور رنگینیوں کے ہجوم میں سادگی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ طنز و ظرافت کا کمال ہے شاعری کی طرح یہ بھی پیغمبری کا جزو ہے اور جب سارے پند و نصائح بے کار ہو جاتے ہیں تو طنز کا ایک ہلکا سا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اُردو کے مشہور مزاح نگار اور طنز نگار رشید احمد صدیقی کی ان تقریروں کا مجموعہ "خنداں" کے نام سے شائع ہوا ہے جو گذشتہ کئی سالوں میں ریڈیو پر سنائی گئی تھیں کتاب کے شروع میں جو مقدمے دیباچے، پیش لفظ اور تعارف وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر قابل اعتنا نہیں ہوتے کیونکہ ان میں سوائے مصنف کے قصیدے اور قوم کے مرثیے کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن اس مجموعہ میں ناشر یا پبلشر کی طرف سے کی طرف سے جو کچھ لکھا گیا ہے پڑھنے کے قابل ہے انہوں نے طنز و ظرافت کی مثال پرانے زمانہ کے جادو عملیات سے دی ہے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر ان میں کہیں بھی خامی رہ جائے تو دشمن کے بجائے خود عامل شکار ہو جاتا ہے، اچھی طنز و ظرافت کا معیار کمال یہی ہے کہ وہ کبھی خالی نہ جائے اس کے لکھنے والے کو پوری پوری آزادی اور سننے والے میں کچھ نہ کچھ صلاحیت ہونی چاہئے اور بعض وقت ریڈیو پر یہ دونوں باتیں متوازن نہیں ہونے پاتے۔

کہا جاتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اپنی ظرافت کے لئے خام مواد شعر وادب سے لیتے ہیں۔ پطرس زندوں سے اور فرحت اللہ مردوں سے، یہ خیال بالکل صحیح تو نہیں مگر اس سے ہر ایک کی خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی بھی اشعار کے برمحل استعمال سے کبھی ان میں تھوڑا سا تصرف کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ پطرس روزمرہ کی چیزوں سے بچوں کے شور اور بائیسکل کی مختلف آوازوں سے شور پیدا کرتے ہیں فرحت اللہ بیگ کی وہ قلمی تصویریں بہت کامیاب ہیں جن میں انہوں نے بعض اشخاص کی سیرت کو زندہ کر دیا ہے۔ انہیں سب سے کم لطف شعر وادب اور اس کی اصطلاحات میں آتا ہے کیونکہ سب ان سے واقف نہیں ہوتے۔ اس سے صدیقی صاحب کا طرز عام فہم نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا ان میں گے یہاں مقامی رنگ بہت زیادہ ہے اور جو لوگ علی گڑھ کی
اقامتی زندگی کچی بارک اور پکی بارک کی بے تکلف چہل پہل مرکب اور یونین سے واقف
نہیں وہ طنز کی واقعیت اور گہرائی پورے طور پر محسوس نہیں کر پاتے یہ بھی صحیح
ہے کہ ان کے طنز میں بیک بہت نہیں وہ موضوع سے اکثر دور بھی جا پڑتے ہیں
اور ادب واخلاق آرٹ اور عورت لمبی لمبی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں، انہیں اکثر متکلم
لگتا ہے۔ واحد متکلم کا صیغہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں یہ سب باتیں
ان کے یہاں پائی جاتی ہیں، مگر ہیں کہ باوجود ان کی طنز انکی گہری اور ان کے
ظرافت اس قدر منفرد ہے کہ وہ اردو کے بہترین طنز نگاروں اور مزاح نگاروں
میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں، ان کی پہلی کتاب مضامین رشید میں ان کی ظرافت کے
بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مگر یہ ظرافت سب کیلئے نہیں، خنداں خاص وعام
سب کیلئے ہے، اس کا طنز زیادہ بعام فہم۔ اس کے موضوع زیادہ ہمہ جہت اور
ہمہ گیر اس کے کردار زیادہ معروف اور اس کے مضامین زیادہ جامع اور
مختصر ہیں اس میں چالیس کے قریب مضامین ہیں جو خاص خاص عنوانوں کے
تحت میں رکھے گئے ہیں، ادھر ادھر کی دنیا میں ریڈیو سننے والے، ہوٹل میں
ریڈیو سفر، دعوت، شراب کی ممانعت،، امتحانات، باغ قابل ذکر ہیں چند معروف
وغیرہ معروف ہستیوں میں استاد خنداں، شیخ پیرو۔ مقدر، لیڈر۔ بالو بیرا
بجرو، ملاح بڑے دلچسپ ہیں، مصنف کے یہاں سب سے زیادہ کامیاب
ہوا ہے، ستی وینستی کے مسئلے پر بھی سملٹ کی طرح غور کیا گیا ہے چنانچہ اس ذیل
میں شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے، اور ایم۔ ایل۔ اے۔ ہونے کے کیا معنی ہیں
خصوصیت رکھتے ہیں چند خاکے کانفرنسوں، عدالتوں کونسلوں اور دوکانوں
کے بھی ہیں، اور آخر میں اردو شاعری میں عاشق، معشوق، رقیب، ناصح اور

دربان کے پنج آہنگ پر بھی طنز در طنز ملتی ہے۔

اکبر کے بعد اردو میں طنزیاتی روح سب سے زیادہ رشید صدیقی کے یہاں ہے۔ ان کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے اور ان کا تخیل خلاق ہے۔ وہ معمولی باتوں میں مضحکہ پہلو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں وہ قول محال (PARADOX) کے ماہر ہیں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے خوب کام لیتے ہیں۔ ان میں بیک وقت سوفٹ کی تیزی، برنارڈ شا کی بذلہ سنجی، چسٹرٹن کی طباعی تینوں کے نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے سجاد انصاری کے اسلوب، فکر، بیان دونوں سے فائدہ اٹھایا ہے وہ اپنے مضامین میں اکثر قصے بیان کرتے ہیں، قصے نئے نہیں ہوتے۔ مگر ان کا انداز بیان قصوں کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ وہ بہت سے کردار تماشے میں جذبات کی خوب خوب مصوری کرتے ہیں، وہ جزئیات میں بہت زیادہ نہیں الجھاتے چند گہرے اور شوخ چھینٹوں سے اپنی تصویریں بناتے اور ان تصویروں کو اس طرح سے یکجا کرتے ہیں کہ منہ سے بول اٹھتی ہے، وہ واقعات میں تسلسل اور غیر متعلق چیزوں میں ربط پیدا کر لیتے ہیں، ان کی تشبیہات نادر اور پر زور ہوتی ہیں وہ باوجود شہری ہونے کے گاؤں والوں کی معاشرت، ان کے ماحول ان کے مزاج کی بہت سچی تصویریں پیش کرتے ہیں انہیں گاؤں کی چیزوں سے صرف ہمدردی ہی نہیں محبت ہوتی ہے ان کی نثر پختہ اور رواں ہے اس میں کہیں عظمت و وقار کی جھلک آجاتی ہے، انہیں اشخاص کی ذاتی کمزوریوں سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی قومی اور اجتماعی خامیوں سے وہ صرف ہنسوڑ نہیں بلکہ ہنسی ہنسی میں ایسی باتیں کر جاتے جن کی خلش عمر بھر نہ جائے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس ظاہری شگفتگی اور زندہ دلی کی تہہ میں ایک ذہنی کرب ایک دلی اذیت چھپی ہوتی ہے "اڈیٹر" میں آج کل کے اخبارات اور ان کے جاہل اڈیٹروں

پر طنز ایسی گہری اور زہریلی ہے کہ اس میں ایک المیہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔
اکبر کے متعلق کسی نقاد کی رائے یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہترین تمدنی نقاد ہیں۔ آج کل کے مزاح نگاروں میں سب سے زیادہ یہ چیز انکے شاگرد رشید میں ملتی ہے، پطرس کے تمدنی مسائل سے زیادہ دلچسپی نہیں وہ اشخاص کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہیں ان کا صرف ایک مضمون لاہور کا جغرافیہ ہے جس میں وہاں کے محکمہ حفظان صحت اور شہریت کے عجیب و غریب نظاروں کی پردہ دری کی گئی ہے۔ فرحت اللہ بیگ کسی نعرے یا برجستہ محاورے سے کام لیتے ہیں۔ ان کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی معلوم ہوتی ہے۔ دونوں کی ظرافت اعلیٰ قسم کی ہے۔ شوکت تھانوی کے یہاں معاشرت پر تنقیدیں بہت ہیں۔ مگر ان میں صحافتی رنگ بہت زیادہ ہے ادب عالیہ کی شان کم۔ مگر ان کی تازگی میں شک نہیں رشید احمد صدیقی اچھے مزاح نگار اور اچھے طنز نگار ہیں۔ انہوں نے اس دور کی ہر خصوصیت پر رائے زنی کی ہے اور جہاں انہوں نے اونچ نیچ یا افراط و تفریط دیکھی ہے۔ اسے ہموار کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً اخبار ہی کو لیجئے صدیقی صاحب کے الفاظ میں آج کل اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہئے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا ہے، اخبار نویسی اس طرح کرنی چاہئے جیسے دن خطرے میں ہے قوم فنا ہو رہی ہے حکومت ناشدنی اور گردن زدنی ہے۔ لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا اور بنک میں حساب کھول دیا۔

ہماری زندگی کا ایک دوسرا جز جلسے ہیں جلسے کر کے ہم اس قدر خوش ہوتے ہیں گویا دنیا کا بہت بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔ تقریریں کرنا، اور تقریریں سننا

ہماری فطرت میں داخل ہے، دوسرے کام کرتے ہیں ہم باتیں کرتے ہیں اگر محض
لطفِ سخن سے دنیا میں کچھ ہو سکتا ہے، تو ہم سب کچھ کر لیتے۔ ایک جلسے کا
سین دیکھئے: نظمیں پڑھی جانے لگیں تالیاں بجنے لگیں، ہار پھول پہنائے جانے
لگے کہ ایک قفلی والے کو آواز لگائی، ایک صاحب کا بچہ مچل گیا۔ انہوں نے مجمع
کے اندر ہی سے قفلی حاصل کرنے کی آزادی میں دخل اندازی ہے للکا
والد نے جلسہ کہ یہ ان کی قفلی حاصل کرنے کی آزادی میں دخل اندازی ہے
للکار کر بولے یہ جلسہ آزادوں کا ہے۔ آزادی پر جان دینے والوں کا ہے
مجمع نے نعرہ لگایا بیشک بے شک آزادی خطرے میں ہے قفلی ضرور کھائی جائے
گی دغا بازوں کا ستیاناس ہو وغیرہ وغیرہ۔

آج کل لیڈری کے جو خواہاں نظر آتے ہیں ان پر تبصرہ دیکھئے دل میں
خوب سمجھتے ہیں کہ عقل نہیں ہے، اتا پتہ نہیں ہے روپے نہیں، فرصت نہیں
ہمت نہیں صورت دیکھ کر عورتیں ہنستی ہیں بچے تالیاں بجاتے ہیں، بوڑھے
گردن جھکا لیتے ہیں بھلے مانس دل بہلاتے ہیں۔ ایمان دار کتراتے ہیں، فقیر
ڈرتے ہیں مرغیاں کٹ کٹ کرتی ہیں لیکن کیا کیجئے جاہ کی ہوس نصیبے کے
الجھن فلاں شخص بڑا کہلاتا ہے۔ ہم کیوں نہ کہلائیں۔

مقرروں کی واہ واہ بھی ہوتی ہے اور ان کی خبر بھی لی جاتی ہے
کوئی مشہور واعظ یا خطیب بڑے ارمانوں سے بلایا جاتا ہے اس کا استقبال
اسطرح ہوتا ہے اسٹیشن پر ہزاروں کا ہجوم، نعروں کی صدا، پٹاخوں کا چھوٹنا
گیندے کے پھولوں کے ہار پہنائے اور پھول برسائے جاتے ہیں کسی نے ہاتھ چومنے
شروع کیے کسی نے سنجیدہ کر لیا کوئی رونے لگا، کوئی شعر پڑھنے لگا کسی نے
زور سے نعرہ لگایا، کسی نے اسٹیشن ماسٹر پر دھول جمادی اور تلی کی

پگڑی چھین لی ایک نے پیچھے سے جیب کتر لی، تقریر ختم کرنے کے بعد مقرر کو دست بوسی اور سلامت روی کے سلسلے میں دیر ہوتی ہے، اب جو دیکھتے ہیں تو نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے ہر طرف اندھیرا ہے اور یہ ہنس بے چارہ۔

اس زمانہ کا سب سے اہم کار نامہ لیڈر رہے، لیڈری کا بھی فن بن گیا ہے صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ جس طرح ہندوستان کے امراض کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اسی طرح لیڈروں کے اقسام معلوم کرنے مشکل ہیں تاہم انہوں نے فصلی ذیلی، کشتی، مادر زاد، اللہ واسطے ربائی شکنی اشتہاری خاموش بہت سی قسمیں گنائی ہیں جس طرح برسات میں کیچڑے، لکڑی، کھوٹ، اور کھٹے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح خاص خاص فصلوں میں فصلی لیڈر پیدا ہوئے مثلاً بقرعید محرم دسہرے، دہلی کے زمانے میں ہر جگہ مارنے مرنے کے نئے لیڈر رونما ہو جاتے ہیں۔ ذیلی لیڈر، ہار پہننے میں لیڈر کے ساتھ اور نعرہ لگانے میں مجمع کے ساتھ ہوتے ہیں اور جب لیڈر جیل خانہ جاتا ہے یہ اپنے گھر آ جاتے ہیں مادر زاد لیڈر اندھے کے مانند ہوتا ہے اسے کچھ نہیں معلوم صورت حال کیا ہے، وہ صرف ہونا چاہئے کے در پے ہوتا ہے، خاموش لیڈر گفتگو نہیں کرتے صرف انٹرویو کرتے ہیں۔

لیڈر کو پبلک کے مفاد کا ہر وقت خیال رہتا ہے ایک پبلک کا نقشہ تو آپ دیکھ چکے ہیں جسے اپنے حقوق کے تحفظ کا اتنا خیال ہے، دوسری پبلک تھرڈ کلاس کے ٹکٹ مل جائے سر پر گٹھری ہر شخص اس کے در پے ہے کہ اسے سب سے پہلے ٹکٹ مل جائے سر پر گٹھری اور بغل میں بستر ہے، کاندھا لگنی کا کام دے رہا ہے، لنگی بچے جنکے ہاتھ میں ہے شلوکے کے بند سے بیوی بندھی ہوئی ہے کوئی کانپ رہا ہے۔ عورتیں کوس رہی ہیں، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں بچے

بلبلا رہے ہیں۔

یہ ہندستان کی سماجی زندگی کی سچی تصویر ہے یا نہیں اس کے دوسرے رخ کو بجرو داد کی زبان سنئے جو جوانی میں ڈاکہ مارتے تھے اور بڑھاپے میں ایک گاؤں کے سردار ہو گئے تھے۔ گاؤں کے بے فکروں نے ان شہری زندگی اور اس کی برکتوں کی تحصیل معلوم کرنی چاہی۔ بجرو داد پہلے تو چپ رہے پھر تمباکو کا ایک آبدار قسم کا کش لے کر چلم کو دوسرے کے حوالے کیا اور کہنے لگے کہ شہروں کا عجیب حال ہے۔ ان کے مکانات بہت بڑے ہی خوبصورت اور بڑے ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں ان کو کھلی ہوا اور روشنی میسر نہیں آتی۔ بڑے بڑے چوڑے راستے ہیں، لیکن ہر روز ان میں کوئی نہ کوئی کچل کر مر جاتا ہے جتنا کام نہیں کرتے اس سے زیادہ دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بجرو نے عورتوں کی تین قسمیں بتاتی ہیں بعض تو ایسی ہیں جنہیں نے سورج اور آسمان کبھی نہیں دیکھے ہیں، گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں بچے پالتی ہیں اور چکی پیستی ہیں یہاں تک کہ ایک دن در و دیوار کی چکی خود انہیں پیس ڈالتی ہے بعض ایسی ہیں خوب بہت پان کھاتی ہیں چھالیاں کترتی ہیں شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں، لیکن اب ایک قسم اور بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ انگریزی بولتی ہیں، ساڑی پہنتی ہیں اور سینما دیکھتی ہیں شوہر ان کی خدمت کرتے ہیں۔ اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں اکبر اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ تھے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر   شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

موجودہ تعلیم کی خرابی پر اکبر کی نظر بھی تھی وہ اسے محض بازاری اور سرکاری سمجھتے تھے، بلوغ اسی کی جس خرابی پر رشید صدیقی کی نظر گئی ہے

وہ بنیادی ہے وہ نظام جو افراد کی صلاحیتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ سب کو ایک ہی قسم کی تعلیم دیتا ہے۔ اور جس کا مقصد کسی خاص منزل کی طرف طالب علموں کی ایک بھیڑ کو ڈھکیل دینا ہے ناقص اور ادھورا ہے۔ ہر فرد کی صلاحیت کو علیحدہ علیحدہ پرکھنا اور اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دینا تاکہ وہ ایک اجتماعی مقصد سے ہم آہنگ ہو سکے۔ ضروری ہے بجز وہ اداس عجائب خانہ کا ذکر کرتے ہیں جس کو شہریوں نے اسکول کالج یونیورسٹی اور بورڈنگ ہاؤس کا نام دے رکھا ہے "یہاں یہ ہر ایک ایک قسم کا منہ بڑھاتے ہیں ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں ایک ہی قسم کا ٹب دیتے ہیں ایک ہی قسم کے کام لیتے ہیں، شندکار پر گزران کرنے والے کو مرد اکھلاتے ہیں کھیت جوتنے والے کو دکنی سے واقف کراتے ہیں ہا ہرن پر گھاس لادتے ہیں نقش نگینے کا کام کرنے والے سے مگدر ہلواتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے کو یورپ کا خواب دکھاتے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ ہندو ایک راستہ پر چلاتے ہیں۔ مختلف صلاحیتوں کا جو خون ہوتا ہے اس پر اقبال کی طنز کبھی اتنی گہری نہیں اگرچہ یہ بھی وہیں کا فیضان ہے۔

دوسرے الفاظ میں رشید صدیقی کی ظرافت محض زندہ دلی ہی نہیں ایک سنجیدہ مقصد بھی رکھتی ہے یہ مقصد ان کے یہاں سب سے زیادہ اہم ہے اس کے بعد ان کے آرٹ کا مظہر ہے یہ آرٹ عجیب و غریب چیزوں کو باہم مربوط باہم رشتہ کر دینے کا آرٹ ہے۔ ندی اور عورت دونوں کا ایک ہی بیوہار ہے، دونوں طاقت اور رفاقت پسند کرتی ہیں۔ یہی ندی جب طغیانی پر آجاتی ہے تو آجکل کے نوجوانوں کے مانند ہو جاتی ہے یعنی ہر قید و بند سے آزاد پولیس اور یونیورسٹی دونوں تحقیقات پر ایمان رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ایک

مزا دلواتی ہے دوسری بند دیتا ہے۔ اکبر شیخ جی کے دونوں بیٹوں کے باہر ہونے
کی داد شاید یہی سوچ کر دی تھی۔ رشید صدیقی کی تشبیہات بھی نہایت چست
اور جاندار ہیں شیخ پیرو کا قد ایک مضبوط نیم سوختہ بول کے تنے کی مانند ہے صدر
کرسی صدارت پر اسطرح رونق افروز ہیں جیسے ڈیوٹ پر کچالو۔ شراب کی بوتل جیب
سے اسطرح برآمد ہوتی ہے جیسے دلہن حجلۂ عروسی سے نکلے یا بہادر کی تلوار
میان سے باہر آئے یا رباب کا خواب مجسم ہو جاتے۔ سرشار کی طرح یہ بھی کرداروں
ایک نگارخانہ پیش کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے لوگوں کی ایسی بھیڑ ہے کہ تصویر گڈمڈ
ہو جاتی ہے۔ اس تصویر میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں
شاعر جو اسطرح شعر پڑھتے ہیں گویا غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے نہیں
ہوتے۔ ڈائس پی انجمنوں پر دانت پیسے کے ہیں۔ مہمان جن کی داڑھی چاولوں کا
مالا ہے اور شوربا گنگا جمنی خضاب کی بہار دکھا رہا ہے۔ گویے جن کا گانا ہنر یا
معلوم ہوتا ہے سخندان جو ہمیشہ اظہار تخلص کر رہتے ہیں۔ بہرے جو معلوم ہوتا
ہے مرچیں کھائے ہوئے ہیں اور بیوی کے قتل کے منصوبے کر رہے ہیں۔ روشن
اور مہذب انسان جو اپنی نیک بختی کو حالی کی مسدس اور دوسروں کی جوان
بخت کو حافظ کی غزل قرار دیتے ہیں۔ ہوٹل میں ریڈیو سننے والے جو ہر وقت
یہ سوچتے رہتے ہیں کہ گھر والی دانت پیس رہی ہوگی اور ہمسائی گرم مصالہ مانگنے
اور چغلی کھانے آئی ہوگی یا لوجن سے جنگ کرنے میں کوئی خطرہ نہیں لیکن جن سے
صلح موت کا پیغام ہے۔ ملاح جو رات کو ڈاکہ ڈالتے ہیں اور دن میں کھیو
چلاتے ہیں۔ بزرگ قوم جو جھوٹ بولتے ہیں اور میٹنگ کرتے ہیں۔ میٹنگ
کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں غرضیکہ اور ایسے ہی بہت سے کردار ہیں جو ذرا
دیر کے لئے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر جب آجاتے ہیں تو سورج چمکتا رہتا

ہے اور غم پاس نہیں پھٹکتا آلڈس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) نے
ایک جگہ لکھا ہے کہ اس دور میں ذہنی نیز اور قوائے جسمانی مضمحل ہو گئے ہیں
جتنے پچھلے بت تھے ہم نے توڑ ڈالے لیکن چونکہ بت نہ بنا سکے اس لئے زندگی
میں ایک خلا محسوس کرتے ہیں بت شکنی اس دور کی خصوصیت ضرور ہے مگر ساتھ
ساتھ بت بنے ہوئے تھے اب ارتقاء مادیت مابعد الطبیعات تصوف
اخلاقیات وغیرہ کے بت بنے ہوئے تھے اب ارتقاء مادیت انسانیت کے بت
ہیں، شاعر، فلسفی، سائنسداں یہ سب نئے بت بنانے میں مصروف ہیں طنز نگار توڑ
تے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور کی روح زیادہ تر طنزیاتی ہے۔
ہمارے ادب میں اس کا عکس سب سے زیادہ صدیقی رشید کے یہاں ملتا ہے۔

اس مجموعہ کی تقریریں سب ایک سی نہیں ہیں یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ انشاء
کے لطیفوں کی مثال پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے
کہیں کہیں تمہید اتنی لمبی ہو گئی ہے کہ اصل عنوان کے لئے گنجائش ہی نہیں رہی انتخابات
اس کی ندایاں شامل ہیں، ریڈیو والوں پر جو توجہ صرف کی گئی ہے اس کے وہ ہرگز
مستحق نہیں بعض مضامین مثلاً ریڈیو کا مستقبل یا اگر میں فاؤنٹین پن ہوتا یا اگر
میں بچہ ہوتا دلچسپ نہیں ہو سکے کبھی کبھی شعر اچھا نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ
مصرع مہمل ہوتا ہے۔

اپنے ایک مضمون میں انہوں نے ساری دنیا میں جہاں کے کوٹ دکھائے
تھے ان کے بھی کوٹ ہیں، عورت اور باغ سے انہیں بڑی دلچسپی ہے چاہے باغ
کی وجہ سے عورت اور ربائے سے۔ الفاظ سے یہ کھیل کھیلتے ہیں اس سے وہ اچھا
کام بھی کبھی یہ رعایت لفظی۔ گھاکھیت ہو کر رہ جاتی ہے اردو کے ایک
مشہور نقاد نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ یہ زندوں سے ڈرتے ہیں اور

مردوں پر نثر ہیں مگر یہ بات تو حالی کی تنقید دل میں بھی ہے، جہاں معاصرین
کی تعریف میں بیحد غلو کیا گیا ہے، مغلائی رنگ کی کثرت ضرور ان کے حلقہ کو
محدود کرتی ہے مگر اس سے ان کی تصویروں زندگی زیادہ آجاتی ہے، پطرس
کی ظرافت ان کے مقابلے میں بڑی زود ہضم اور ہلکی پھلکی ہے، اس کی مثال
فواکہات کی سی ہے جس سے خون بڑھتا ہے اور چہرہ روشن ہو جاتا ہے، رشید
صدیقی کی ظرافت میں زیادہ وزن ہے اور اسی وجہ سے کہیں کہیں
ثقالت بھی۔ پطرس دوسروں پر ہنس اپنے لطف زندگی میں اضافہ کرنا چاہتے
ہیں کہ میرا مقصد آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں تاثرات میں تنوع پیدا
کرنا ہے، دلچسپ فقروں، دلکش کرداروں، گہری طنز اور وقیع ظرافت
کے علاوہ ان کے یہاں نثر کا ایک منفرد اسلوب بھی ملتا ہے جس میں اقبال کے
اشعار اور ابوالکلام کی نثر کی عظمت جھلکتی ہے۔ یہ عظمت ظرافت کی وجہ
سے دب گئی ہے، مگر بعض جگہوں پر نمایاں ہو ہی جاتی ہے۔ ان کا آخری مجموعہ
"گنج ہائے گراں مایہ" اپنی مرقع نگاری کے علاوہ اپنی رفیع و وقیع نثر کی وجہ
سے بھی اہم ہے۔



جدید اُردو تنقید

اکبر کا ایک مشہور شعر ہے

قافیوں میں حسن معنی گم کرد — شعر میں کہتا ہوں بے تم کرد

تنقید کا یہ تصور پہلی جنگ عظیم تک بہت عام تھا۔ جنگ نے جہاں بہت سے بت توڑے وہاں بعض نئے بتوں کی پرستش کا بھی آغاز کیا اور ادیب و زندگی کے متعلق اشاروں میں کرنے کے بجائے صاف اور واضح اصولوں جامع تصورات اور بلند معیاروں کی ضرورت محسوس کی۔ حالی نے جو مسائل چھیڑے تھے ان کی اہمیت رفتہ رفتہ تسلیم کی گئی اور ان کی پیروی تو بہت دیر میں شروع کی گئی۔ حالی نے شاعری کو ایک شوق فضول سمجھنے کے بجائے قومی اور تہذیبی شعور کو سنوارنے اور نکھارنے کا ایک آلہ سمجھا۔ انہوں نے اخلاقی قدروں کو بھی اہمیت دی مگر اخلاق کے تصور کو محدود اور مبہم رکھا۔ انہوں نے ادب میں سادگی اصلیت اور جوش کی اہمیت جتا کر ہماری شاعری کو زندگی انسانوں اور سچے جذبات سے قریب کر دیا۔ انہوں نے غزل سے انکار نہیں کیا مگر غزل کی اصلاح ضروری

سمجھا اور چونکہ لکھنؤ اسکول اور دہلی اسکول کے درمیانی شعرا نے صناعی اور فن کی پرستش سے شاعری کو مصنوعی اور محدود کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے اجتہاد کی تاریخی اور ادبی اہمیت مسلم ہے انہوں نے مرثیہ اور مثنوی میں اخلاق اور واقعہ نگاری پر زور دے کر اردو ادب میں اعلیٰ انسانی قدروں اور تنقید نگاری کیلئے میدان ہموار کیا، حالی ہمارے پہلے بڑے نقاد ہیں جنہیں تجربات میں فرق کرنا آتا ہے اور جو قدروں کا احساس رکھتے ہیں مگر تجربات اور قدروں کی وضاحت نہ کر سکے وہ مغربی ادب سے زیادہ واقف نہ تھے، وہ ہمارے ادب کی خامی کا احساس شدت سے رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے پاس کیا نہیں ہے، کیا ہونا چاہئے پر بھی ان کی نظر تھی مگر کیسے ہو کیلئے وہ ہمیں زیادہ مدد نہیں دے سکے۔

جنگ عظیم کے بعد عبدالحق، وحید الدین سلیم نے ایک تو ادبی تنقید کو مستقل آزاد اور پورے وقت کی چیز بنایا، دوسرے اس تنقید میں ایک تاریخی شعور ماحول کا احساس اور تہذیبی اثرات کا ممکن دیکھا، پھر حالی کے اصولوں سے مدد لے کر بڑھی ہوئی روایت پرستی کے خلاف سختی سے آواز بلند کی اور صناعی اور ذہنی تعیش کا پردہ فاش کیا۔ افادات سلیم اور مقدمات عبدالحق میں تنقید کا اصلاحی رجحان غالب ہے مغرب کا اثر بھی، مگر مغرب طاری نہیں ہے، قدیم سرمائے کی عظمت کا اعتراف ہے مگر اس مقدس ماننے سے انکار بھی ہے ان دونوں نے ہمارے ادبی سرمائے کا جس طرح جائزہ لیا ہے اس طرح اتنی تفصیل سے حالی نے بھی نہیں لیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے حالی ہی کے اصول برتے ہیں۔ دونوں علی گڑھ تحریک کے آخری بڑے اثر کو ظاہر کرتے ہیں جو ادب پر پڑا یا نکی

مستقل قدر و قیمت ہے۔ دونوں بڑے اچھے محقق ہیں۔ اس تحقیق سے ان کی تنقید میں وزن آتا ہے، وہ تاریخ پر بھی نظر رکھتے ہیں مگر فلسفہ اور نفسیات کا علم انہیں نہیں ہے اس وجہ سے وہ بڑے نقاد نہیں کہے جا سکتے۔

ان کے ساتھ مغرب کے اثر سے دو اور نقاد ہمارے ادبی افق پر نمودار ہوئے ایک عبدالرحمٰن بجنوری اور دوسرے عظمت اللہ خان بجنوری نے غالب کی تنقید میں تحسین پر زور دیا مگر تحسین میں تخلیقی شان ضرور پیدا کی، ان کے ہاتھوں تنقید خشک بے جان فارمولا یا بے مس پیمانہ نہ رہی، ایک دلچسپ ذہنی رفیق بن گئی۔ بجنوری بڑے اچھے نقیب تھے، انھوں نے دیوان غالب کا تعارف بڑے رومانی انداز سے کیا ہے۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب " ان کا ذہن مغربی ہے انکے ساتھ سفر میں ہم صرف غالب ہی سے نہیں گوئٹے شکسپیر براوننگ اور خود بجنوری سے بھی دوچار ہوتے ہیں، ان کی تنقید سراسر داخلی ہے تمام تر جذباتی ہے یکسر شاعرانہ ہے، یہ تنقید نہ بہت گہری نہ زیادہ جامع مگر اس کا مطالعہ ہمارے لئے مفید ضرور ہے، یہ شعر کے ہجے نہیں کرتی، شعر کو شعر بناتی ہے، بلکہ کہیں شاعر کے ساتھ پرواز کرتی ہے بجنوری کے اثر سے ہمارے ادب میں کئی مغربی شخصیتیں داخل ہو گئیں خصوصاً جرمن شعراء اور وہ نہ اچھے نقاد ہیں نہ بڑے نقاد مگر ان کی تنقید نے آئندہ تنقید نگاروں کے لئے راستہ صاف کیا اور تنقید میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ انھوں نے تنقید کو ادب بنانے میں امداد دی۔

اس زمانہ میں عظمت اللہ خاں کی شاعری اور ان کے مضامین کی سے معاشرت ہوئی عظمت اللہ خاں ایک تجربی جربہ نے کر ہماری ادبی محفل میں داخل ہوئے اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے اپنے اکھڑے اکھڑے نیم مغربی انداز

میں غزل پر ایک کاری ضرب لگائی عظمت اللہ خاں نے بات نئی نہیں کہی تھی حالی نے بھی غزل کی مقبولیت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا مگر حالی مصلح تھے باغی نہ تھے عظمت اللہ خاں باغی تھے انہوں نے اعلان کیا کہ غزل کی گردن بے تکلف ماردینی چاہئے۔ اس کی وجہ سے بہت سے ان سے بدظن ہو گئے اور ان کے خیالات کی اہمیت کو نظر انداز کرنے لگے عظمت اللہ خان نے سنجیدگی کے ساتھ غزل کی نارسائی واضح کرکے اس کی پراگندگی اور انتشار پر زور دے کر فکر کے عنصر کی اہمیت کو نمایاں کرکے فارسی کی بحروں کے علاوہ ہندی کی بحروں کے ترنم کو اختیار کرکے ہندوستانی تہذیب کے اجزا کو شامل کرکے شعریت کے حدود کو وسیع کیا۔ ان کے ہاتھوں میں تنقید مغربی بھی ہوتی ہے اور ہندوستانی بھی بجنوری اور عظمت اللہ خاں آنے والی بہار کے پھول ہیں۔ بہار نہیں ہیں۔

عظمت اللہ خاں کے بعد مغرب سے اور قریب ہوتی گئی۔ محی الدین زور اور سروری نے مغربی تنقید سے ہمیں آشنا کرانا چاہا مگر وہ اس کام کے اہل نہ تھے ان میں ترجمانی کی صلاحیت نہ تھی وہ نقیب بھی نہ تھے جیسے کہ بجنوری تھے۔ ان کی تنقیدوں میں ہمیں بہت سے نام، بہت سی کتابیں اور اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے مگر یہ تنقید مسلسل بندی ہے اردو کے اسالیب بیان اور دنیائے افسانہ میں مغرب کے مشاہیر بار بار سامنے آتے ہیں مگر سب پرچھائیاں ہیں ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں۔ مغربی تحریکوں کا چاپلوس کر ہے۔ م بکثرت ہیں مگر ادبی فضا کا کہیں پتہ نہیں۔ نہ ان اصولوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے جو ان بزرگوں نے برتے۔ ان کی تنقید قاموسی قسم کی ہے یہ طالبوں کے لئے مفید ہے۔ اس لئے معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے ذہن میں روشنی پیدا نہیں ہوتی۔ پہلے کس کی مجال تھی کہ ایک مضمون میں شعرا د شاعرانہ

یہ مغربی تنقید سطحی بھی تھی اور محدود بھی ایسے اپنے ادب کا اتنا ہی علم تھا جتنا عبدالحق اور سلیم کو، مغربی ادب کا علم بھی یونہی سا تھا مغربی ادب کی روح سمجھنا صرف انگریزی ادب سے ناممکن ہے۔ اس کے لئے فرانسیسی اور جرمن ادب سے بھی آشنا ہونا چاہئے۔ انگریزی ادب میں سب کچھ انگریزوں کا نہیں۔ بیرا عظیم یورپ کا بھی ہے۔ اس تنقید میں تاریخی شعور تھا مگر ناقص اس پر صرف مغرب طاری تھا۔ اس میں ترجمانی کے بجائے تقلید اہم آہنگی کے بجائے نقالی نمایاں ہے۔ اس کا سارا سرمایہ شعرالہند اور گل رعنا سے بھی ہلکا ہے جو تنقیدیں نہیں تذکرے ہیں مگر اپنی دیا طا کے اندر کامیاب ہیں۔ اس میں زبان کوئی بڑی تہذیبی خدمت انجام نہیں دیتی۔ محض بیان واقعہ ہے اس کا کوئی بڑا سوچا ہوا اور جامع اصول بھی نہیں۔ اس کا ایک ہی کارنامہ ہے اور وہ بھی منفی یہ اپنے قدیم سرمایہ سے بیزار ہے۔

ادب لطیف پر اعتراضات کرنا اب عام ہو گیا ہے مگر انشاپردازی نے اردو کو ایک بڑا اتضاد دیا ہے یہ نیاز میں یوں بھی سجاد حیدر، مہدی افادی سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار کے یہاں ادب کے ساتھ ایک سچا عشق اور شعریت کا ایک دلکش احساس بھی ملتا ہے۔ مگر نیاز کے یہاں ایک نازک جمالیاتی احساس کے ساتھ قدیم ادبی سرمائے سے گہری اور جدید سرمائے سے خاصی واقفیت ملتی ہے جسے ان کی انشاپردازی نے حسن دیا ہے۔ نیاز قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں ہو جانے تاریخ اتارتے اور شعریت عطا کرتے ہیں، جوش و اصغر کے متعلق ان کے اعتراضات اور فراق و علی اثر کی تحسین غور سے پڑھنے کے قابل ہے نیاز کے یہاں تعمیری اور تخریبی دونوں۔ اسلا جینس ہیں وہ اس دور کی نئی تہی مائیگی پر بجا طور پر معترض ہیں، مگر

ان کی تنقیدوں میں ندروں سے زیادہ شخصیات سے شغف ملتا ہے نگار کے خاص نمبروں نے اردو تنقید کے متعدد خلاؤں کو پر کیا ہے اور کتنے ہی تاریک گوشوں کو روشن اسی لئے حالی سلیم اور عبد الحق کے بعد نیاز ہمارے بڑے نقادوں میں ہے بلکہ ادبی شعور کی گہرائی کے لحاظ سے وہ سلیم اور عبد الحق سے بھی بلند ہیں، انتقادیات ہماری تنقید میں ایک مفید اضافہ ہے۔ عبد الحق نے ہمارے کلاسیکی ادب کو جسے ہم مردہ سمجھ بیٹھے تھے، ہمارے لئے زندہ کیا مگر نیاز نے اسے آب و رنگ اور شگفتگی عطا کی۔

یہ حالات تھے جب ترقی پسند تنقید وجود میں آئی، شروع میں اس کا خیر مقدم اچھا نہ ہوا، ایک غلط فہمی کی بنا پر (جیسے اقبال نے ترقی دی اقبال کی شاعری کو مغربیت کے خلاف ایک جہاد سمجھا جانے لگا ایک سکڑی سمٹی اور سہمی ہوئی مشرقیت اپنے بچاؤ کے لئے آخری لڑائی تھی اب تک نئی تنقید کی ساری کوششیں منفرد کوششیں تھیں، ان کا کوئی واضح تہذیبی پس منظر نہیں تھا، نئی تنقید کو ادبی محفل میں برابر کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ چہ جائے کہ رہنمائی اور رہبری کا یہی وجہیں تھیں جن کی بنا پر شروع شروع میں اس کی اہمیت واضح نہیں ہوئی۔ پھر ابتدا رہی میں ایسے انگارے کے خلاف ایک طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں نیا پن ادب کے حقیقی منصب کو بھلا کر چونکانے یا سنسنی پھیلانے میں مصروف ہو گیا تھا، اسکے علمبردار صرف نقاد ہی نہ تھے، وہ شاعر بھی تھے، اڈیٹر بھی، مضمون نگار بھی، سیاسی کارکن بھی ادب ان کا تنہا وظیفہ نہ تھا، ایک وسیلہ، ایک ذریعہ، ایک آڑ تھا۔

مگر اس کے باوجود ترقی پسند تنقید کا اثر بہت جلد ظاہر ہونے

لگا ہے بکم جیند کے خطبے میں ترقی پسند ول کے مضامین میں سجاد ظہیر کے دیباچوں میں، احمد علی اور اختر رائے پوری کے مضامین میں کلیم کے شماروں اور نیا ادب کے شماروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ ایک کی مشکل اختیار کو لی جو اپنی اہمیت میں علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری بڑی سے تحریک ہے اور جس نے اُردو ادب میں ایک انقلابی تصور حیات کو جنم دیا۔

ترقی پسند تحریک نے یوں تو شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری مضمون نگاری مضمون نگاری میں قابل قدر اضافہ کئے ہیں، مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ تنقید ہے اس کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تنقید کو ادب میں اسکا منصب عطا کیا ہے۔ اس نے تنقیدی شعور کی تہذیب میں حصہ لیا ہے اور ہر تخلیقی کارنامہ میں ایک واضح تنقیدی شعور پر اصرار کیا ہے۔ تنقید کی اہمیت کو ظاہر کر کے اور تنقید کو اعلیٰ ترین ادب قرار دے کر اور تنقید کے ذریعے سے منفرد ادبی کارناموں میں ایک مسلسل تصور حیات دیکھنے کی کوشش کر کے ترقی پسند تنقید نے ادب کو بڑے فائدے پہنچائے ہیں ان فائدوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ادب کو شاعری کی آمریت سے اور شعر کو جذبے کی آمریت سے آزاد کرنا معمولی کام نہیں۔ یہ کام شروع تو حالی کے وقت سے ہو چکا تھا، مگر اسے انجام کو ترقی پسند تحریک نے پہنچایا۔ شاعری، شعریت، شاعرانہ اسلوب شاعرانہ زبان، ادب کے ہر گوشے پر قابض تھی، علمی، سنجیدہ، سائنٹیفک نثر بہت کم تھی اور کبھی تھی تو اسے بار بار کوئی نہ کوئی آڑ لینی پڑتی تھی آج سے دس پندرہ سال پہلے کس کی مجال تھی، کہ ایک مضمون میں شعر اور شاعرانہ خیال سے آنکھ بچا کر گزر جانے کون پکاریگا۔ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ شاعری

جس میں جذبہ بہت زیادہ ہے حسن رکھتی ہے، مگر مستقل طور پر تسکین نہیں پہنچا سکتی
بلکہ جذبہ اور فکر کی ہم آہنگی ضروری ہے یہ کون منوا سکتا تھا کہ ادب میں کوئی سرمایہ
محض اپنا نہیں ہوتا کون محسن صداقت شعراء کے لفظوں سے مرعوب نہ ہوتا بلکہ
ان کے معنی کو دریافت کرتا کسے یہ کہنے کی جرارت ہوتی کہ ادب کو سائنس...
اقتصادیات، نفسیات، تاریخ سے علیحدہ رکھنا بے ادبی ہے، کون ادبی شہرتیں
عطا کرتا اور چھینتا، قدریں بناتا اور ناقد کرتا، کون ادب کو زندگی کی
وسعتیں دیتا اور اس سے زندگی اور انسانیت کے کام میں مدد دی، ترقی پسند
تنقید شروع میں علمی قسم کی تھی بڑی رعونت رکھتی تھی پرانی چیز سے گریز کرتی تھی
ہر نئی چیز سے محبت، اس لئے کہ وہ نئی ہے اختر رائے پوری کا "ادب اور انقلاب"
کو بعض نقادوں نے ایک عہد آفریں مضمون کہا ہے مگر یہ اس کا عہد کا نمائندہ
ہے جو تنقید سے زیادہ تبلیغ کا قائل تھا۔ ترقی پسند تنقید اس ادھ کچرے
فلسفے اور باغیانہ تصورحیات سے آگے نکل چکی ہے اس مضمون میں ہمارے
قدیم سرمائے کو جن الفاظ میں یاد کیا گیا تھا، اس سے قدیم سرمایہ کا تو کچھ نہیں
بگڑا، نقادوں کی سطحیت واضح ہو گئی، احمد علی نے اپنے مضمون میں اقبال
اور ٹیگور کی شاعری کے متعلق کہا تھا کہ یہ بیماریوں کی طرح زندگی سے
گریز کرتی ہے، یہ تنقیدیں سطحی اور ناقص تھیں مگر سجاد ظہیر نے مجاز کے
مجموعہ پر جو دیباچہ لکھا ہے اس میں ایک اور رجحان ملتا ہے یہاں تخلیقی کارناموں
کو سماجی تحریکات کے پس منظر میں دیکھنے کے قابل قدر کوشش ہے۔ یہاں شاعر
کے فکر کے طور پر کو پانے کی تلاش ہے مگر مقصد کی خاطر تنقید کو لفظ تو دی
بنایا گیا ہے، سرتاپا انقلابی شاعر نہیں۔ وہ دراصل ایک رومانی شاعر
ہیں جو انقلابی رجحانات رکھتے ہیں ان کا کارنامہ ہے کہ انہیں "بزم

خوبیاں "کے حسن کے علاوہ بڑے مقاصد کا حسن بھی نظر آجاتا ہے اسی طرح کیفی اعظمی کی نظموں پر لکھتے وقت سجاد ظہیر ان کے واضح نصب العین کو کافی سمجھتے ہیں کیفی کی نظموں کی وقتی ندرو قیمت کو نظر انداز کر دیتے ہیں پھر بھی سجاد ظہیر کی تنقید میں سماجی اور اقتصادی حالات کے احساس کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔

سجاد ظہیر اور دوسرے ادبی مبلغوں کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ نقادوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ وجود میں آگیا۔ ان میں فراق مجنوں، فیض احمد فیض، احتشام حسین اختر انصاری، عزیز احمد، تاثیر اور دوسرے نقاد آتے ہیں۔ ان میں سے اصول اور کے کارناموں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا مشکل ہے لیکن بعض عام اصول اور بعض مشترک خصوصیت کا بیان ہو سکتا ہے نگار کے خاص نمبروں مصحفی نمبر، نظیر نمبر کے علاوہ شعراء کے اپنے انتخاب پر تبصرہ قابل ذکر ہیں ان میں ہمارے ادبی سرمایہ کا ایک سنجیدہ متوازن اور ترقی پسند تصور ملتا ہے یہ سب ماضی کے زریں کارناموں سے واقف ہیں، ان میں سے کئی تو قدیم ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں، تقریب قریب سبھی شاعر ہیں، اور اس جذبے تک پہنچ سکتے ہیں۔ جو شاعری کی روح ہے ان کا ایک اوصاف اور واضح فلسفہ حیات نے ایک بلند سماجی مقصد کے تصور اور ایک اچھے ادبی ذوق، دونوں کی ہم آہنگی نے ان کی تنقیدوں میں زندگی اور ادبیت پیدا کی۔ حالی پر فراق کی تنقید، نظیر پر مجنوں کی رائے ترقی پسند ادب پر فیض کے مضامین آزادی ادب از اختر انصاری، اور عزیز احمد کی نئی کتاب "ترقی پسند ادب" ہمارے تنقیدی سفر میں ایک سنگ میل کا کام دیتے ہیں۔

اس عرصہ میں جب کہ ترقی پسند تنقید سستی مغربیت کو چھوڑ کر اپنے قدم

جاری تھی ایک اور نقاد نے جنم لیا۔ کلیم الدین احمد کی کتابیں۔ "اردو شاعری
پر ایک نظر" اور "تنقید پر ایک نظر" اس کی مثال ہیں کلیم الدین کی تنقیدوں
میں بڑی قطعیت ہے۔ وہ زیادہ تخریبی ہیں ان میں مغربیت بہت زیادہ ہے
مگر اس کے باوجود ادب میں عالمگیر اصولوں پر زور تعمیری صلاحیتوں پر
اصرار اور ادب و تنقید میں فن کی بلندی اور گہرائی پر توجہ صحیح ہے، کلیم الدین
مشرقی ادب سے زیادہ واقف نہیں وہ لطیف اور رنگین کیفیات تک نہیں پہنچ
سکتے، وہ شعر کے اچھے نقاد نہیں مگر ان کی ادبی تنقید میں اپنی خیال آفرینی اپنی
گہرائی اور شدت کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتی ہیں۔ انہوں نے "اردو
تنقید پر ایک نظر" میں بے دھڑک دار کئے ہیں اور شاید کوئی بھی آگ
کے بے دریغ سے محفوظ نہیں رہ سکا، مگر یہ بت شکنی بت پرستی سے
بہتر ہے جو ذہن کو منجمد اور محدود کر دیتی ہے، اور کسی بڑے ادیب کے
خلاف ایک لفظ سنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔

کلیم الدین کی قطعیت اور مغربیت دلچسپ سہی، مگر حال میں تنقید میں
ایک اور رجحان پیدا ہوا ہے جو اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے
نفسیاتی تنقید مغرب کی خاصی مقبول رہی، اس کے خلاف ردعمل بھی شروع
ہو گیا اس اسکول کے نقادوں نے فرائڈ اور دوسرے ماہرین نفسیات
کے نظریوں کو سامنے رکھ کر شاعروں اور ادیبوں پر عمل جراحی شروع کیا
نتائج نہایت دلچسپ بلکہ سنسنی خیز نکلے، کتنے ہی رنگین خواب کھلونوں کی
طرح ٹوٹ گئے اور کتنی ہی لطیف یا دبی تلخ حقیقتوں کی نظر آئیں
نفسیاتی تحقیق اہم اور مفید ضرور ہے مگر حرف آخر نہیں ہے اور اسے
ابھی تک مکمل سائنس کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ اس لیے ایک شاعر کے متعلق

متعلق ایک نقاد نے ایک نظریہ پیش کیا ہے اور دوسرا دوسرے نے
فرینک ہیرس نے شکسپیر کے تعیش ذہنی (EROTIC MANIA) البیر
جیس نے اس کی ذہنی صحت اور جسمانی صحت دونوں کا دعویٰ کیا اس قسم
کی تنقیدوں پر ایک طالب علم نے بہت اچھی رائے دی تھی، امتحان میں
کسی مذہبی بحث کے متعلق سوال تھا، طالب علم نے لکھا کہ " مذہبی کتابوں میں
تو کچھ ہے ہے ہاں بعض مفسروں کی شرحوں میں بہت کچھ ملتا ہے۔ میراجی نے
ادبی دنیا میں جو نفسیاتی تجزیئے کئے تھے، ان میں شاعر سے زیادہ نقاد
نمایاں تھا اردو کے رسالوں میں جو نفسیاتی تجزیئے شائع ہوتے ہیں ان میں
لاشعوری میلانات پر زور دیا گیا ہے حالانکہ لاشعور میں شعور کی حکومت
انسانیت کے ارتقاء کو بہتر طور پر ظاہر کرتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے
کارنامے محض ماہرین نفسیات کے اصولوں کے نتیجے نہیں ہیں، فنکاروں کی
شخصیت میں وراثت اور ماحول کی عجیب کشمکش ہوتی ہے، دونوں کو نظر انداز
نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ نفسیاتی تنقید میں خارجیت
ہونی چاہیے یعنی فنکار کی نفسیات کو سائنٹفک طریقے سے سمجھنا چاہیے
محض اپنے ذوق کی چیزیں ڈھونڈھنا چاہیئں۔ اردو میں نفسیاتی تنقید نے
ابھی بلوغت کی منزل طے نہیں۔ اس کی افادیت میں کلام نہیں مگر اسے سب
کچھ نہ سمجھنا چاہیے نفسیاتی تنقید تو زیادہ شخصیت کی بھول بھلیاں میں کوئی راستہ
تلاش کرتی ہے۔ لیکن مارکسی تنقید کا دائرہ اس سے زیادہ وسیع ہے۔
مارکس کا فلسفہ محض اقتصادی عمل اور ردعمل کو سمجھنے کے لئے اہم نہیں۔ اس
سے ادب اور زندگی کے رشتے پر بھی بڑی روشنی پڑتی ہے۔ مارکسزم کو برٹرینڈ
رسل نے سائنس کی تاریخ اور تاریخ کی سائنس غلط نہیں کہا ہے، مارکسی تنقید

کے مطابق مادی زندگی میں پیداوار کے طریقے، اجتماعی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے رجحانات کو متعین کرتے ہیں۔ احساس اور شعور بھی اجتماعی زندگی سے بنتا ہے اور حسن کے نظریئے، اقتصادی نظریوں کا اثر قبول کرتے ہیں طبقوں کی تقسیم جاگیرداری، سرمایہ داری اور، اشتراکیت کے دو الگ الگ حسن کے نظریئے رکھتے ہیں، یا مختلف پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ مارکسی خیال کے مطابق افادیت میں حسن ہے لیکن افادیت کے محدود معنی میں لینے کے بجائے وسیع معنی میں لینا چاہیئے مجنوں، سجاد ظہیر، احتشام، عبد العلیم، سردار جعفری نے اس خیال کو پھیلانے میں بہت حصہ لیا ہے۔ مارکسی تنقیدوں کے خلاف جو مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ان میں علمیت کم ہے، تعصب زیادہ، اس کے اثر سے ہماری تنقید میں سائنٹیفک اور علمی رنگ، زندگی اور اس کی تاریخ کا علم کائنات کی تبدیلیوں کا احساس اور انسانیت کے مستقبل سے محبت آئی ہے۔ یہ غلط ہے کہ مارکسی تنقید ماضی کو نظر انداز کرتی ہے۔ اور مغرب کی نقالی پر مبنی ہے کاڈویل کی کتاب فریب اور حقیقت ILLUSION AND REALITY کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسی نظریہ تنقید ماضی کے روشن کارناموں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ ماضی اور حال کا ایک واضح سلسلہ قائم کرتا ہے مشرق اور مغرب کی تقسیم ہمارے یہاں ایک ذہنی کجی کا باعث بن گئی ہے مارکسی تنقید نے اس کجی کو واضح کر کے ادب پر ایک احسان کیا ہے۔ اس نے شاعری اور ادب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ اسے ایک سنجیدہ تہذیبی درجہ دیا ہے وہ ہر قسم کے چٹخارے کو برا سمجھتی ہے چاہے وہ معاملات کا ہو یا ادب لطیف کا یا موجودہ لذتیت کے ادب کا وہ ابہام و اہمال کے خلاف ہے، چاہے وہ آزاد نظم کیوں نہ ہو وہ ادب کو جینے خود ساختہ دیوتاؤں

کے ہاتھ میں رہنے کے بجائے عام لوگوں کی دولت بنانا چاہتی ہے ابھی اردو میں تنقید عام نہیں ہوئی مگر اس کا اثر ہونے لگا ہے جو ایک اچھا شگون ہے۔

اردو ادب میں تنقید اب بیدار اور دوربین ہو رہی ہے اس نے اپنی اہمیت کو منوا لیا ہے اس نے ادب اور ادیبوں سے جو مطالبے کئے ہیں ان کو پورا کرنے کی سعی شروع ہو گئی ہے۔ آزاد نظم غزل کے خلاف بغاوت سے وجود میں آئی۔ ناول پر جو توجہ اب ہو رہی ہے وہ نقادوں نے دلائی ہے۔ اتیری صلاحیتوں کا ابھرنا اصول بحثوں کا سامنے آنا، عام اصطلاحوں کے فریب سے نکلنے کی کوشش کرنا ہر پرانی حقیقت کو نئے سرے سے دیکھنا اور پرکھنا تنقید کے اثر سے آیا ہے۔ تنقید نے ادب میں خارجیت پیدا کی ہے اور شاعری نے جو جذباتی طوفان اٹھائے تھے ان کی قوت کو زندگی کے قافلے کے لئے اسیر کر لیا ہے، فضا ایک بڑے نقاد کے لئے سازگار ہے۔



حیاتِ شبلی

ایک تبصرہ

مہدی افادی اپنے ایک مشہور مضمون اُردو ادب کے عناصرِ خمسہ میں سرسید اور ان کے معاصرین کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو وہ کچھ نہیں رہتے نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے صرف سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے لیکن آقائے اُردو پروفیسر آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جنہیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

یہ رائے دلچسپ ضرور ہے مگر صحیح یقیناً نہیں ہے، اچھا ادب کسی اچھے
مقصد کے سہارے کے بغیر پھل پھول نہیں سکتا۔ اسی کے اثر سے اس میں آب و رنگ
آتا ہے اس کی آنچ میں تپ کر قلم الفاظ میں طلوع کی سی تیزی پیدا کرتا ہے، یہ سہارا
اگر زنجیر بن جائے اور لکھنے والے کی انفرادیت اس کے شخصی اور ذاتی نقطہ نظر
کو ابھرنے نہ دے تو ادب کا گلا گھٹ سکتا ہے، ادب لولا لنگڑا نہیں کہ اسے
بیساکھی کی ضرورت ہو، اسے سوز دروں خون جگر اور نفس آتشیں کی
ضرورت ہے وہ محض تفریح یا انبساط یا دل بہلانے کا ذریعہ نہیں، وہ محض
شیریں دیوانگی نہیں مہذب سنجیدگی بھی ہے وہ محض ہر غم کو غم جاناں بنانے
کا نام نہیں، غم دوراں زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا نام بھی ہے۔ ان
عناصر خمسہ میں عروس زندگی کی حنا بندی سب سے زیادہ سرسید حالی اور شبلی نے
کی ہے، نذیر احمد اور آزاد اب دوسری صف میں ہیں۔

حالی صرف سرسید کے ایک ممتاز رفیق ہی نہیں ان کے سوانح نگار بھی ہیں
حیات جاوید سوانح عمری سرسید کی ہے مگر اس میں حالی کی شخصیت کا عکس بھی
ہے سرسید کی زندگی کو حالی نے قوم کی تاریخ بنا کر پیش کیا اور قومی ضروریات
کے لحاظ سے رنگوں کو ہلکا گہرا رکھا انہوں نے دیباچہ میں دعویٰ کیا تھا کہ سرسید
کا سونا کسوٹی پر کسا جائے گا اور اس کا کھرا پن کھوٹ تک بجا کر دیکھا جائے گا
اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ
وحیدالدین سلیم سے لے کر شیخ چاند تک سب نے لکھا ہے یہ بات تک فیصلہ
کتاب میں تو نہیں شبلی نے تو اس کتاب کو "کتاب المناقب یا ال مداحی" اور "کذب
وافتراء کا آئینہ" کہا اور بلاوجہ حالی کے بہت بڑے مداح ہونے کے سوانح
نگاری کے اس طریقے کو پرفریب بنایا، مگر حالی اتنے گنہگار نہیں جتنا کہ شبلی انہیں

سمجھتے ہیں، حالی کی یہ کمزوری ضرور ہے کہ وہ وہاں بھی خاموش رہتے ہیں جہاں خاموشی
گناہ ہے۔ انہوں نے سرسید کی بہت سی کوتاہیوں کی تاویلیں کی ہیں اور بعض اوقات
کتاب "اعذار" معلوم ہوتی ہے انہوں نے اسکا بالکل ذکر نہیں کیا کہ
ایک زمانے میں وہ خود سرسید کے طرز عمل سے اتنے بیزار رہتے کہ وقار الملک
اور محسن الملک کے ساتھ ان کے خلاف اخبار میں بیان دینے کو تیار تھے۔ سرسید پر
بیگ کا جو مناسب حد تک اثر تھا حالی کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ پھر بھی حیات
جاوید اردو کی بہترین سوانح عمری انیسوی صدی کی تعلیمی، ادبی، مذہبی
اور سیاسی کش مکش کا ایک دلکش اگرچہ یک طرفہ مرقع اور حالی کے بال کے
برابر باریک اور تلوار سے زیادہ تیز، اسلوب کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔
حالی نے سرسید کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک
واقعہ بہت دلچسپ ہے، سرسید چاہتے تھے کہ ان کی سوانح عمری شبلی لکھیں
جب شبلی کو حالی پر کیوں ترجیح دی اور شبلی نے کیوں انکار کیا، یہ بات صاف
ہو جائے تو سرسید اسکول اور شبلی اسکول کی چشمک کا راز سمجھ میں آ جائے اور حیات
جاوید اور سید سلیمان ندوی صاحب کی نئی کتاب حیات شبلی کا موازنہ اچھی طرح
ہو سکے۔ یہ کام حالی اور شبلی کے درجے کو متعین کرنے کے لئے ہی ضروری نہیں
شبلی اور سرسید کے نقطہ نظر سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ حالی جدید سوانح
نگاری کے بانی ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں حیات سعدی لکھی جسے
شبلی بے مثل مانتے ہیں۔ شبلی کی پہلی مستقل تصنیف اور اردو کی دوسری نئی طرز
کی سوانح عمری المامون شائع ہوئی جس کی سرسید نے بڑی تعریف کی اس کے
اس کے بعد تصانیف کا تانتا بندھ گیا۔ شبلی قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے
تو ان کی شہرت ایک سوانح نگار اور شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں تھی ایک

عالم اور مورخ کی حیثیت سے بھی تھی پھر سید چاہتے تھے کہ ان کی سوانح عمری بھی اس پایہ کی جس پایہ کی المامون اور سیرۃ النعمان وغیرہ تھیں اور جس پائے کی الفاروق ہونے والی تھی۔ مگر اس عرصہ میں سرسید اور شبلی کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہو چکا تھا۔ مولوی عبد الحق۔ شرر اور اکرام کا خیال یہ ہے کہ شبلی سرسید ایک خلیفہ ہونے پر راضی نہ تھے وہ خود پیر طریقت ہو جانا چاہتے تھے۔ مہدی نے بھی اپنے ایک مضمون میں اس خیال کی حمایت کی ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کے نام تک نہ آنے پایا مگر یہ محض ذاتی قابلیت کا غرور اور ہم چو من دیگرے نیست کا جذبہ نہ تھا دونوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی تصورات میں بہت فرق ہو گیا تھا شبلی نے علیگڑھ پہنچ کر بہت ترقی کی تھی، وہ سرسید سے بھی آگے دیکھ رہے تھے وہ ایسے شخص کی سوانح عمری کیونکر لکھ سکتے تھے جس سے ان کا اختلاف بڑھتا ہی جاتا ہے۔

شبلی کے انکار کی وجہ تو صاف ہو گئی۔ لیکن یہ بات ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ سرسید نے حالی کے ہوتے ہوئے شبلی کو کیوں ترجیح دی شبلی نے ایک جگہ اپنا اور حالی کا مقابلہ کیا ہے اور انصاف یہ ہے کہ خوب کیا ہے وہ کہتے کہ:

"میں دریا ہوں اور حالی کنواں جب تک مواد کافی نہ ہو تحریر موجود نہ ہو میں ایک بھی چل نہیں سکتا۔ مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔"

ممکن ہے سرسید سوانح میں اور وسعت چاہتے ہوں ممکن ہے شبلی کے

علی گڑھ میں موجود ہونے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سرسید شبلی کی کس قدر قدر کرتے ہیں۔

اکرام نے موج کوثر میں شبلی کو سرسید کا مدمقابل قرار دیا ہے یہ بات صحیح نہیں شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اگر حیات شبلی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح ہو جائے گی۔

حیات شبلی، سید سلیمان ندوی نے لکھی ہے، وہ شبلی کے جانشین اور ان کے دارالمصنفین کے روح رواں ہیں شبلی کی لائف لکھنے کی بہت سے لوگوں نے خواہش کی تھی مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر سب کاموں سے فارغ ہو کر سلیمان ہی لکھیں سید سلیمان نے شبلی سے جو کچھ سیکھا تھا یہ کتاب لکھ کر احسان کا بدلہ دیا ہے۔ یہ ایک طور پر سرکاری (OFFICIAL) سوانح عمری ہے اور صاف ظاہر ہے کہ لکھتے وقت قدم قدم پر حیات جاوید پیش نظر ہے، شروع میں لکھا ہے۔

نوسو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ در حقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے۔

یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے شبلی کا اس زمانے کے بنانے میں بہت کچھ حصہ ہے ان کی زندگی کے چالیس سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے، انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سے نہ صرف صحیح علمی مذاق پھیلانا چاہا بلکہ قدیم و جدید کا ایک ایسا سنگم بنانا چاہا جس میں بسر ہوئے۔ انھوں نے بھی آکر ملاحظہ کیں، وہ ایک قدیم ماحول سے آئے تھے مگر انھوں نے جدید تحریک کی بہت سی مفید باتوں کو اپنایا، وہ یورپ کے علمی کارناموں کا احترام کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی تحقیق و تدقیق کی داد دیتے تھے یورپ سے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ یورپ سے سرسید کی طرح مرعوب نہ تھے یہ بات بھی کچھ ایسی بے معنی نہیں کہ سرسید نے انگلستان کا رخ کیا، مگر شبلی مصر و شام

کی سر کرنے گئے۔ شبلی مولوی تھے عالم دین تھے۔ علوم مشرقیہ کے فاضل تھے بقول مہدی افادی تاریخ کے معلم اول تھے۔ انہوں نے اُردو میں تاریخ کو واقعہ نگاری سے نکال کر ادبی علوم کی سرحد میں داخل کیا، اور فلسفہ و تاریخ کا امتزاج کیا۔ مگر سید سلیمان ندوی نے انہیں عہد جدید کا معلم غلط کہا ہے۔ یہ لقب سرسید ہی کو زیب دیتا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے ابتدائی صفحات میں شبلی کی حیات پر موجودہ مواد کا جائزہ لیا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے مفید کتاب "مکاتیب شبلی" ہے اس کے بعد دیباچے میں مولانا کے کارناموں کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

شبلی بھی سرسید کی طرح نئے حالات اور نئی ضروریات سے متاثر تھے وہ علوم جدید کی تعلیم کے حامی تھے یورپ کی ترقیوں کے مداح تھے سرشید کا خیال یہ تھا۔ اپنی علمی تحریک کی بنیاد مغرب کی طبیعاتی علوم پر رکھنی چاہیے۔ وہ قدیم خیالوں کے لوگوں سے قیامت تحمیں کرنے لوگوں کے ہاتھ میں دینا چاہتے تھے شبلی خود ایک قدیم دبستان سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے ذہن میں ترقی اور نشو ونما کی صلاحیت تھی علی گڑھ نے شبلی کو بہت کچھ دیا۔ انگریزی کی تعلیم اور علوم جدید کی تعلیم کی اہمیت کا انہیں یہیں اندازہ ہوا۔ مگر ان کا مشن یہ تھا کہ مسلمانوں کی قیادت حالات زمانہ سے باخبر اور حریت پسند عالم کریں۔ یہ مشن بہت مبارک تھی، مگر کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ علماء سے یہ امید کہ وہ روایت پرستی کو چھوڑ دیں اور علوم جدیدہ کو اپنا لیں آخر میں غلط ثابت ہوئی۔ شبلی اس بھاری پتھر کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے، مگر انہوں نے اس کی بنیاد میں روزن ضرور ڈال دیا انہیں نئی تعلیم یافتہ نسل پر کچھ زیادہ اعتماد نہ تھا شبلی کی ساری زندگی ایک علمی جہاد تھی، وہ اپنے علمی کاموں میں بھی ایک حد تک کامیاب ہوئے مگر سب سے زیادہ کامیابی انہیں انہیں علمی میدان میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے کلام سے صرف

معترضوں کی زبان بندی ہی نہیں کی بلکہ بند دلوں کو کھولا بھی انہوں نے اسلاف کے کارناموں سے جذباتی عقیدت کو ایک ذہن دیا اور ایک استواری انہوں نے قدیم اسکول کو بچا لیا ورنہ سرسید کی تحریک اسے ختم کر دیتی محض بچایا ہی نہیں اس کو کوڑے مار مار کر بیدار کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ بقول اکرام آج قوم کی ذہنی زندگی میں ان لوگوں کا اثر زیادہ ہے جو سرسید سے شبلی سے متاثر ہو۔

دیباچے میں سید سلیمان ندوی نے شبلی کی جامعیت پر بجا زور دیا ہے اُردو کو علمی زبان بنانے اور اسے ترقی دینے میں بلاشبہ ان کا حصہ بہت ہے ان کا مطالعہ وسیع تھا ان کا علم حاضر تھا ان کا اسلوب سادہ رنگین اور عالمانہ : ان کے ذہن میں الجھن نہ تھی۔ اور ان کی تحریر میں پیچیدگی ناپید حیات شبلی کا یہ حصہ بہت اہم ہے اور لکھنے والے کی عقیدت کے علاوہ اس کے اپنے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

دیباچہ کے بعد ایک طویل مقدمہ ہے جو پچاس صفحے کے لگ بھگ اسمیں سید صاحب نے بڑی محنت سے یورپ کے علمی ذکر کیا ہے ان بزرگوں کے نام گنائے ہیں جو رشد کے علاوہ درس و تدریس کا بھی فرض انجام دیتے تھے۔ ان مدرسوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے دم سے علم کی شمع ان علاقوں میں روشن تھی اور اس سلسلے میں سینکڑوں کتابوں، رسالوں، کتب خانوں اور علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کام بڑا وقیع اور غالباً اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا شبلی جس زمین کی پیداوار تھے وہ کوئی دور افتادہ ویرانہ نہ تھی صدیوں سے موتی اگل رہی تھی اور مولانا ان تمام خانوادوں کی علمی روشنی کی کرن تھے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ یہ بحث علیحدہ کتاب میں ہوتی یا مختصر طور پر آتی تو زیادہ بہتر تھا حیات شبلی میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔

مقدمے کے بعد اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد شبلی کی ولادت تعلیم و تربیت، ابتدائی مشاغل، علی گڑھ کالج کی ملازمت اور اس زمانے کے علی گڑھ کی زندگی کا عکس ہے۔ ان تفصیلات سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں شبلی کا ذوق علمی، ان کی شاعری کا رس اور ان کے ذہن کی بڑائی اور آزادی، یہ واقعہ ہے کہ سرسید نے شبلی کو شبلی بنایا ان کے تصورات سے ان کا ذہن بہت وسیع ہو گیا۔

۱۸۸۷ء سے شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوتا ہے المامون شائع ہوتے ہی مقبول ہوئی مگر اس زمانہ کا سب سے قابل ذکر واقعہ ان کا روم و مصر و شام کا سفر ہے شبلی جذباتی آدمی تھے اس سفر نے انکو مسرت و عبرت دونوں کا سامان دیا، وہ ترکوں کی شان و شوکت دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور قدیم علوم کی کس مپرسی اور ناقدری دیکھ کر خون کے آنسو بھی روئے، جابجا انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اشعار میں کیا ہے عربوں اور ترکوں سے ان کو بڑی عقیدت تھی، عربوں سے اس وجہ سے کہ وہ اسلام کے پہلے معمار تھے، ترکوں سے اس وجہ سے کہ وہ اس زمانے میں اسلام کے دنیوی اقتدار کے نمایندے تھے۔

شبلی کے لیے علی گڑھ کا میدان بہت جلد تنگ ہو گیا، سید سلیمان کے نزدیک اس کے کئی وجوہ تھے، ادیب، معاملہ داں، بشوق، بے لحاظ، دشمن، سرسید ترکوں کے مخالف تھے شبلی ان کے فدائی، سرسید انگریزوں کے حامی تھے شبلی انگریزوں پر نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے سرسید جمہوریت کے خلاف تھے اور انتخاب کو برا کہتے تھے شبلی کی رائے دوسری تھی سرسید الفاروق لکھنے کے خلاف تھے شبلی اس کو اپنی زندگی کا کارنامہ سمجھتے تھے، مذہبی عقائد میں فرق تو تھا ہی کچھ سیاسی اختلافات تھے۔ کچھ ذاتی چشمک غرض شبلی سرسید کے مرنے کے بعد علی گڑھ سے رخصت ہوئے کچھ دن حیدر آباد میں خالص علمی

کاموں میں لگے رہے۔ سلسلہ آصفیہ میں کئی کتابیں تیار کیں۔ مگر شوق انہیں پھر
شمالی ہند میں لایا اور اب کی ندوہ کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

شبلی نے اپنا سب سے قیمتی وقت ندوہ کی اصلاح کو دیا انہوں نے اسے اپنے
خون سے سینچا، ان کے زمانے میں ندوے کا شہرہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ اسکی
مالی حالت مضبوط ہوئی اس کی عمارت بنی، اس کے نصاب میں بڑی بڑی مخالفتوں
کے بعد کچھ اصلاح ہوئی، مگر انصاف یہ ہے کہ ندوے کو بہت کچھ فائدہ پہنچانے
کے باوجود مولانا ندوے اور وہاں کے بے حس ضعیف علماء نے شکست دی خود
ان کے عزیز دوستوں نے ان کی معمولی سی اصلاحیں مثلاً انگریزی کی لازمی تعلیم
اور نصاب میں غیر ضروری جزوی اور فروعی مباحث کا اخراج بہت دن تک
ٹالیں اور یہ بہت بعد میں عمل میں آئیں، وہ چونکہ مزاج کے سخت تھے اور جلد
خفا ہو جاتے تھے اس لئے ان کی مخالفت بھی ہوئی۔ وہ کام کرنے کے خیال سے
چونکہ اپنا نام آگے رکھتے تھے اس لیے لوگوں کو رشک و حسد بھی پیدا ہوا
شبلی سرسید کی طرح اپنے رفیقوں کو ساتھ کرنا چاہتے تھے، انہوں نے
مزاج میں لوچ نہ تھا، وہ بہت سے کام ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے، انہوں
نے بہت سے کام کئے بھی مگر بہت سے کام نہ کر سکے۔ سرسید نے ایک کام ہاتھ
میں لیا اور اسے مضبوط بنیادوں پر قائم کر گئے۔

سید سلیمان ندوی صاحب نے ان باتوں کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے
ندوہ کے ایک ایک اجلاس کی روداد، ایک ایک تجویز کا خلاصہ، ایک ایک
اقدام کا جائزہ۔ اگر شبلی کے قدم ندوہ میں جم جاتے تو یہ ایک انقلابی کارنامہ
ہوتا۔ بقول شروانی "شبلی قدیم رنگ کے علماء میں شیر و شکر نہ ہو سکے اور وہ
انہیں ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔" اسی بات سے شبلی آج ہماری نظروں میں بلند ہیں۔

شبلی کی سیاسیات پر سید صاحب نے بہت اچھی بحث کی ہے شبلی دراصل
لبرل تھے۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے ابھی ہم
کو پالیٹکس کے قابل بننا ہے۔ ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے ہماری
تعداد کم ہے اس لئے نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں شبلی
مسلمانوں کی پولیٹکل کوڈٹ میں سرسید کی پالیسی کی ترمیم کو ضروری قرار
دیا تھا۔ موجودہ پالیٹکس غلط ہے۔ ابھی شبلی کے نزدیک صحیح پالیٹکس تھی
ایک اور جگہ لکھا ہے۔ رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس
رہا۔ سرسید سے ہاں ہاں کہتیں رہیں"۔ انہوں نے اس زمانہ کی سیاست پر اپنی
نظموں میں اظہار خیال کیا ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے بہت سے وقتی ہیں مگر
شبلی کا رنگین اسلوب، دلکش اشارے، پر زور لہجے اور مترنم زبان کی وجہ سے یہ نظمیں اب
بھی حرارت دیتی ہیں۔ مسجد کانپور کے واقعہ پر لکھتے ہیں۔

کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشۂ شباب — ظاہر میں گو کہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ — مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار — از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں

شہر آشوب اسلام، ڈاکٹر انصاری کی واپسی، احرار مسلم لیگ پر ان
کی نظمیں اب بھی دلوں کو گرماتی ہیں۔ ان کے یہ اشعار آج بھی صحیح معلوم ہوتے ہیں

موزوں نہیں ہے جنبش اعضا کو کیا عجب — شب کے خمار کی ہیں یا دن کی بند گراں ابھی
غوغا ہے کچھ مباحث ملکی نہیں ہیں یہ — اک طفل ہے سیاست ہندوستاں ابھی

جنگ عظیم پر ان کے یہ اشعار انگریزی حکومت کو بہت ناگوار گذرے تھے۔

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از راہ غرور — آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم — اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رند لم یزل — آئین شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں
ہم لوگ اہل ہند ہیں جرمنی سے دس گنے — تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور — پھر وہ کہا کہ لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

سید سلیمان صاحب نے یوں تو شبلی کے سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے مگر ان کے اخلاق وعادات کا بیان نہایت دلچسپ مفصل اور روشن ہے اس شبلی کے علمی و ادبی ذوق کے علاوہ ان کی مخصوص طبیعت انکی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزیں۔ ان کا وسیع حلقۂ احباب، ایک عالم ہوتے کے باوجود ان کی شاعرانہ شوخیاں، ان کی باقاعدہ زندگی کا پروگرام شاگردوں سے محبت کی محبت انکی سخت عصبیت، خودداری، بلند ہمتی، ہر بات میں اپنے کو لئے دیئے رہنا۔ ان سب باتوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے سید صاحب نے ایک ایک چیز کا حوالہ پیش کیا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ جان بوجھ کر بمبئی کی بعض تعلیم یافتہ خواتین سے ان کے مراسم کا ذکر نہیں کرتے یہ بات ممکن ہے کہ ان کی ثقہ طبیعت کے لحاظ سے مناسب نہ ہو مگر ادب میں یہ ذہنیت اچھی نہیں ہے خطوط شبلی کو مختلف لوگ مختلف باتیں دیکھنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ ہڈسن نے ٹھیک لکھا ہے کہ سوانح میں ہر بات قابل ذکر نہیں ہوتی ہو یا جس میں عام انسانی دلچسپی کا کوئی پہلو ہو شبلی کا بمبئی کا قیام محض علمی تصانیف کے لئے وقف نہیں ہونا تھا، وہاں اس وجہ سے بھی جاتے تھے کہ انہیں وہاں آرام ملتا تھا اور ان کا دل بہلتا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو ڈاکٹر انصاری کے قدموں پر سر رکھنے اور بوسہ دینے کے لئے اس وجہ سے تیار تھا کہ وہ ترکی کی خدمت کے لئے جا رہے تھے، تعلیم یافتہ اور اچھے خیالات

رکھنے والی خواتین کی محبت سے متاثر ہونا، قدرتی بات تھی۔شبلی تو شاعر تھے۔
اکرام نے شبلی نامہ میں شبلی اور عطیہ بیگم فیضی کے تعلقات پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے ادھر اردو رسالوں میں اس کے متعلق خوب خوب مضمون نکلے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ شبلی ایک مولوی ہوتے کے باوجود روشن خیال اور زندہ دل آدمی تھے اور ان کی تعلیم یافتہ خواتین سے متاثر ہوئے، اس اثر سے ان کی شاعری اور شخصیت میں بڑی رنگینی اور تازگی آگئی وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے عورتوں کی ترقی اور سماجی زندگی میں ان کی شرکت کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے، وہ نہ خشک نہ تھے شاعر تھے حسن سے متاثر ہوتے تھے اور اگرچہ ان کی پبلک لائف انہیں اپنے فطری جذبات پر بند باندھنے کے لئے مجبور کرتی تھی، مگر ان کی ادبی اور تصنیفی زندگی پر ان مراسم کا بڑا خوشگوار اثر ہوا ہے۔خطوط شبلی کے مطالعہ کے بغیر آپ ایک عالم، ایک مصنف اور مولوی تک پہنچ سکتے ہیں۔اس شبلی کی روح کو نہیں سمجھ سکتے جس کی حکیمانہ نکتہ سنجیوں اور شاعرانہ شوخیوں سے اردو ادب میں شادابی اور رفعت آئی ہے۔
کتاب میں بعض اور بھی خامیاں ہیں شبلی کے پاؤں کے واقعہ پر جتنے قصائد اور نظمیں لکھی گئی ہیں۔سب خواہ مخواہ درج کی گئی ہیں۔بہت سے واقعات دہرائے گئے ہیں۔ندوے کے واقعات کی اتنی تفصیل کی ضرورت نہ تھی نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت تھی کہ اس زمانے کے جتنے نیک کام تھے ان میں مولانا شبلی کا ہاتھ ضرور رہتا، سرسید کی انگریزی پرستی پہ اعتراض ہے۔مگر شبلی جب انگریز گورنر کو بلا کر ندوے کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں تو اس کی ادبی زبان سے تعریف کی گئی ہے غرض حیات شبلی باوجود اپنے واقعات کی تفصیل اپنے موضوعات ومباحث وجامعیت کے باوجود اپنے جوابول

کی صحت اور اپنے استدلال کی وضاحت کے شبلی کی ترجمانی ہے ان پر تنقید نہیں، حیات جاوید اور حیات شبلی ایک دوسرے سے اتنی دور ہوتے پر بھی بہت قریب ہیں، دراصل ہمارے دور کو صرف سرسید اور شبلی کے بجائے دونوں کی ضرورت ہے، اور اس طرح محمد علی اور اقبال نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ اسی طرح ہم بھی کر سکتے۔

شبلی کا اثر حالی کی طرح صرف ادب پر نہیں پڑا، پوری ذہنی زندگی پر پڑا۔ اپنے دور میں وہ سب سے رنگین جاذب نظر اور جامع شخصیت رکھتے ہیں، وہ اگرچہ ایک لحاظ سے سرسید سے قدیم ہیں مگر آخر دور کے سرسید کے مقابلے میں زیادہ حریت پسند ہیں۔ انہوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم میں ادب کی تازگی اور شگفتگی پیدا کی انہوں نے علماء کی ایک نسل کو اپنی ماضی کا تجزیہ کرنے اور حال سے فیض اٹھانے کے لئے تیار کیا، وہ سرسید اور حالی جیسے سادہ مزاج نہیں تھے ان میں ایک عالم کی شان تھی۔ وہ دوسروں کی تعریف بھی کم کرتے تھے مگر وہ بڑے ستھرے اور دلکش ذوق کے مالک تھے، وہ مولویوں کی اصلاح نہ کر سکے مگر نئی نسل کے خیالات پر گہرا اثر چھوڑ گئے مگر افسوس ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان کی علمیت پر نظر رکھی ان کے ذہن کی لچک اور مغربیت پر توجہ نہ کی۔ مگر نئی

نسل شبلی کے اثر سے اپنے گھر سے زیادہ واقف اور اپنے تہذیبی سرمائے سے زیادہ آشنا ہو گئی، شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اور اقبال کہاں ہوتے ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے



مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں

کہانیاں مجھے پسند ہیں کسے نہیں ہوتیں ؛ مگر ہر قسم کی کہانیاں نہیں آخر طوطا کہانی ، ایکٹ کہانی ، چھبیلی بھٹیاری کی کہانیاں بھی تو ہیں۔ پھر نادان خدا پرست اور دانا دنیادار کی کہانی ، بھی لکھی گئی ہے — اور ایسی کہانیاں بھی جو بقول مصنف تحلیل نفسی کے اصول پر ترتیب دی گئی ہیں۔ خارستان اور گلستان نسرین ، نوش اور خارا ، سایگی ، غزالہ ریحانہ ، نوشابہ حمائی ، شہاب جیسے ناموں اور کارناموں سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں۔ یہ بات نہیں کہ حسین عورتوں ، جگمگاتے زیوروں ، پر اسرار شخصیتوں جذباتی اتار چڑھاؤ ، شاعرانہ فضا سے مجھے لگاؤ نہیں ہے اور نہ بہت ہے مگر پھر بھی کہانی پڑھتے وقت نہ دھوکہ کھانا چاہتا ہوں اور نہ دوسرے کی آنکھ میں دھول جھونکنا پسند کرتا ہوں ، میں کہانی ، کہانی کی طرح پڑھتا ہوں اس میں مضمون کا سا لطف ، شعر کی رنگینی ، فلسفے کی گہرائی ڈھونڈتا اور پاتا ہوں ، مگر افسانہ کو شعر یا فلسفہ نہیں بنانا چاہتا مجھے نقاب

پوش اشخاص ہی نہیں ۔ نقاب پوش اسالیب سے بھی کچھ چڑھ سی ہے ۔ میں دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھوڑنے یا پیچھے سے وار کرنے کو بہت اچھا نہیں سمجھتا تھے کہانیاں اس لئے پڑھتا ہوں کہ ان میں لطف محسوس کرتا ہوں کچھ سیکھتا ہوں ۔ اور افسانے میں کسی کو بنتے بگڑتے دیکھ کر خود بھی بنیا بگڑتا ہوں ، اچھے افسانے سے میری زندگی کا علم کچھ اور بڑھ جاتا ہے ، تجربہ کچھ گہرا ہو جاتا ہے ۔ انسانوں کی فطرت ان کے اتار چڑھاؤ کچھ سمجھ میں آنے لگتے ہیں ۔ افسانہ وہ فریب ہے جو حقیقت کو کچھ اور روشن کر دیتا ہے ، وہ جھوٹ ہے جو بغیر سچ کی مدد کے خوبصورت نہیں معلوم ہوتا ۔ افسانہ پڑھنا میں ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتا ہوں ، عبادت نہیں تصور کرتا اگرچہ میں نے سنا ہے کہ مومن کا ہر کام عبادت ہے ۔

قبل اس کے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے کون کون سی کہانیاں پسند ہیں ، یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میری پسند بدلتی رہتی ہے اور غالباً یہ عمل آپ کے ساتھ بھی ہوتا ہوتا ہوگا ۔ پہلے مجھے وہ کہانیاں پسند تھیں جو یا تو بڑی بوڑھیاں سناتی تھیں یا نول کشور پریس کی یاد امی کاغذ والی کتابوں میں ملتی تھیں مجھے اس وقت اس سے سروکار رہتا کہ پھر کیا ہوا ؟ کیوں اور کیسے سے غرض نہ تھی ۔ انار توڑو تو پریاں کیوں نکلتی ہیں اور کسی حوض میں کود و تو پرستان میں کیسے پہنچ جاتے ہیں ۔ یہ باتیں غیر متعلق تھیں جب کہ ہم کہانی کہنے والے کی جادو کی چھڑی سے پرستان میں فوراً پہنچ سکتے تھے چنانچہ ان کہانیوں میں ایک شہزادہ جسے صرف تین سمتوں میں جانے کی اجازت تھی چوتھی سمت ضرور جاتا تھا ورنہ کہانی کیسے چلتی پھر اسے ایک حسین شہزادی ملتی تھی مگر وہ ایک خون کے دریا میں تہا کر اس کو حاصل کر پاتا

غرض شہزادہ کی بہادری شہزادی کا حسن خون کا دریا اور ہیرے کے پھول ان سے کہانیوں کے محور رہتے۔ ان کاغذی پھولوں کو میں سب کچھ سمجھتا تھا ان کا جادو مجھے اب تک بھولا نہیں ہے پھر وہ زمانہ آیا جب کیوپڈ اور سائیکی، نگارستان اور گلستان اور کہکشاں کا ایک ساتھ اچھے معلوم ہونے لگے۔ انہیں پڑھ کر دل کی لگی بجھتی بھی تھی اور بھڑکتی بھی تھی۔ یہ افسانے نہ تھے۔ اچھے خاصے نیم برہنہ رقص تھے معلوم نہیں ان سے روح بیدار ہوتی تھی یا نہیں، بدن ضرور بیدار ہوتا تھا اگرچہ جسم جیسے بیدار یہ زمانہ بھی گذر ہی گیا۔

پھر نہ معلوم کیسے میں نے پریم چند کی کہانیاں پڑھ اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ مجھے شروع میں یہ بری معلوم ہوئیں کچھ پھیکی پھیکی سی کچھ بے جان سی ان میں نہ تو کسی کا ملکوتی حسن ہوتا تھا جس کی خاطر آدمی شہر چھوڑ دے اور مر جائے اور نہ ہیرو کے ایسے کارنامے جو ہم جیسے معمولی کمزور پراگندہ دل سے سرزد نہ ہو سکیں ان میں کبھی کوئی کسان ہوتا، کبھی کوئی سیٹھ ساہوکار کبھی کوئی راجپوت سردار یا کوئی غریب برہمن، کوئی ماما ہوتی یا کوئی چمارن جس کی بیٹیا پر ترس آتا اور تھوڑی سی جھنجھلاہٹ کہ گئے تھے نماز بخشوانے الٹے روزے گلے پڑ گئے، یعنی خیال تو یہ تھا کہ قصہ پڑھ کر لطف اٹھائیں گے اور اس کے بجائے ملی ایسی گریہ و زاری اور دکھ بھری داستان جس کی وجہ سے اچھا خاصا موڈ خراب ہو جائے مگر رفتہ رفتہ شعور آیا نئے احساس اور نئے ذہن نے کایا پلٹ کر دی زمانہ کے حالات انگریزی ادب کے مطالعہ ان کی برکتوں اور نعمتوں نے ذوق میں تبدیلی پیدا کی شیرینی میں تلخی کا احساس ہوا۔ تلخی شیرینی بن گئی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں نے رفتہ رفتہ اور سب افسانوں کی یاد دلی سے

محو کردی، حج اکبر مزا ملنے لگا۔ دو بیلی بار بار یاد آئے۔ نجات کا تصور رہنے لگا، بلکہ
شطرنج، بڑے بھائی، شکوہ شکایت، نئی بیوی، کفن پڑھے اور پھر پڑھنے کو جی چاہا
اوروں کے نزدیک ان کی زبان غلط ہے۔ ان کے مکالمے بالکل فطری نہیں
ان کے کردار جذبات کے پوٹ ہیں۔ ان کی سب دیہاتی عورتیں، دیویاں ہیں
اور سب دیہاتی مرد دیوتا۔ ان کی محبت فرشتوں کی سی ہے یا بچوں کی سی اور ان
کے افسانے صحیح معنوں میں کئی افسانوں کی لڑیاں ہیں، یہ سب ٹھیک ہے مجھے
پریم چند کی اور بھی بہت سی خامیوں کا احساس ہے مگر ان کے افسانوں میں
جیتے جاگتے انسان اور جانی پہچانی زندگی ملتی ہے وہ فطرت کی عین گود بھی
دیکھ لیتے ہیں اور اس میں بدصورت انسانیت بھی اور بڑی بات یہ ہے کہ
پریم چند میں اس بدصورت انسانیت سے محبت اور اسے حسین اور مقدس
و پاکیزہ بنانے کی خواہش بھی ہے۔ بظاہر پریم چند کی کہانیاں پروپیگنڈہ ہیں
اس لئے کہ زندگی خود پروپیگنڈہ ہے۔ مگر پریم چند کوراج کے بوڑھے
بخری کی طرح ہمارا دامن پکڑ کر نہیں بیٹھ جاتے وہ ایک اچھے اور خاموش
رفیق ہیں اور ذہن پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اپنی بات واضح کرنے کے لئے میں پریم چند کی ایک کہانی خاص طور سے
ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے بہت پسند ہے اس کا نام ہے "کفن" یہ دو
ایسے چماروں کی کہانی ہے جن کی دین و دنیا دونوں چوپٹ ہیں ایک باپ ہے دوسرا
بیٹا، بھوک کے مارے گرے پڑے آلو چن کر الاوہ میں بھون کر کھا رہے ہیں بیٹے کی
جوان بہو کوٹھری کے اندر دردِ زہ میں پڑی تڑپ رہی ہے مگر بیٹا اس ڈر
کے مارے اسے دیکھنے اندر نہیں جاتا کہیں باپ سب آلو نہ کھا جائے وہ بیچاری
تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے مگر انہیں خبر نہیں ہوتی، صبح کو وہ روتے

پیٹتے زمیندار کے پاس جاتے ہیں جو کفن دفن کے لئے کچھ روپے دے دیتا ہے۔ مگر یہ ننگے بھوکے بے حیا باپ بیٹے سب روپے شراب وکباب میں اڑا دیتے ہیں۔ کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر زندگی میں صرف وہی باتیں نہیں ہوتیں جو ہم چاہتے ہیں یا ہم جنہیں اچھا سمجھتے ہیں۔ پریم چند زندگی سے اتنے سستے مقابلے پر راضی نہیں ہے وہ اسے پھولوں کی سیج ہی بنا کر پیش کریں، یہ نہ ہونا چاہئے یا کاش ایسا ہوتا جیسے خیالوں میں مست رہنے کے بجائے پریم چند مردانہ وار یہ بتاتے ہیں کہ دیکھو یوں بھی ہوتا ہے، زمانے میں ہم اپنے سماج کے زخموں اور ناسوروں سے اپنی جہالت اور گندگی سے منہ چھپا کر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ مگر پریم چند ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگاتے ہیں، اپنا اپنا طریقہ ہے کوئی بدبو سے بچنے کیلئے عطر میں ڈوبا ہوا رومال ناک پر رکھ لیتا ہے کوئی اس کا احساس عام کرکے اسے دور کرنا چاہتا ہے۔ پریم چند کے ہاتھوں میں افسانہ عطر میں ڈوبا ہوا ریشمی رومال نہیں رہا پریم چند جھنڈا یا نشان بن گیا۔

ان کی آواز میں ایک ایسا سوز وگداز تھا کہ ان کی ہمنوائی کے لئے ایک اچھا خاصہ حلقہ پیدا ہو گیا۔ جنگ عظیم بعد سے افسانہ نگاری کو بڑی ترقی ہوئی ہے اور خصوصاً گذشتہ پندرہ سال میں نوجوانوں نے اس ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے، افسانوی ادب کی مقبولیت بعض کے نزدیک علمی تہی مائیگی کی دلیل ہے حالانکہ یہ دلیل کم مائیگی کی ہے تہی مائیگی کی نہیں اچھا افسانوی سرمایہ ادبی دولت ہے مگر یہ دولت ہے، ادبی کام میں نہیں لگائی جا سکتی جس طرح ایک شاعر سے یہ امید نہ رکھی چاہئے کہ وہ اپنے ایک ہی شعر سے تجربہ گاہ اور کارخانے کی ریاضت سے قوم کو بے نیاز کر دے گا اسی طرح افسانہ نگار کے بوئے بیجوں سے بہت جلد فصل کاٹنے کی امید رکھنی چاہئے ان بیجوں اور انکی

کھینچ کو میں چند مثالوں سے واضح کر دوں گا۔

کرشن چندر کی ایک کہانی "بے رنگ دلبو" آپ کہیں گے کہ لوگوں کو رنگ دلبو پسند ہوتے ہیں لیکن یہ "بے رنگ دلبو" کیوں پسند ہے، سنئے اس میں ذکر ہے ایک طالب علم کا جو کرایہ کا مکان تلاش کرتا ہے، مگر اسے کامیابی نہیں ہوتی پہلے وہ ایک سکھ دوکاندار اور اس کی بیوی سے دوچار ہوتا ہے دوکاندار کو کھانسی ہے اور اس کی زرد رو بیوی کی دھوتی کا ایک گوشہ ایک بچہ پکڑے رہتے جاتا ہے، دوسرا گود میں اٹھائے ہوئے ہے تیسرا اس کے پیٹ میں ہے وہاں سے گھبرا کر آگے بڑھتا ہے تو ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے ایک بابو صاحب ہیں جو صرف اسی کو جو صرف اسی کو شریف سمجھتے ہیں جس کی بیوی اور بچے ہیں اور جس مرد کے پاس عورت نہیں اس کی نہ تو کتنی ہو سکتی ہے اور نہ اسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے اور اب کی بار مکان کی مالکہ کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی نظر آتی ہے جس کی زندگی اس وجہ سے پھیکی اور بے رنگ دلبو ہے کہ اس کا شوہر دن بھر دفتر میں گذارتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے تو اسے ایک مزدور ملتا ہے "جو یہ دریافت کرنے پر کہ بیوی ہے ہنستے ہوئے جواب دیتا ہے" جی سرکار" کیا ہوا اگر وہ غلام ہے کم از کم اس کا بھی تو ایک غلام ہے اور شام کو یہ طالب علم اسی طرح واپس ہوسٹل پہنچ جاتا ہے جہاں راج ہنس اور انقلاب کی چیخ دیکھ لیتا ہے اور ساگ والی کا ٹھی پھل۔ مگر ٹھہریئے، یہ بات کیا ہوئی۔ کرشن چندر نے اس چھوٹے سے افسانے میں ہندوستان کے متوسط طبقے کی زندگی کا ایک سچا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کی تصویریں بظاہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں، مگر ان میں ایک خاص ترتیب ضرور ہوتی ہے۔ یہ تو نوجوان افسانہ نویس خوبصورتی اور غریبی

سے بہت متاثر ہوا ہے اور خوبصورتی کو عام کرنے اور غریبی کو کھو دینے کی کوشش میں اپنے طور پر مصروف ہے۔

اس کی ایک اور کہانی کا نام ہے "زندگی کے موڑ پر" یہ ذرا طویل افسانہ ہے۔ ایک ہے شری پرکاش وہ اپنی بہنوں کو لے کر اپنی ایک رشتہ کی بہن پرکاش وتی کی شادی میں سری پور ایک قصبے میں جاتا ہے پرکاش اس کی بہن لیلا اور سوشیلا لاری کی مسافر وہ ذات عورت جس کی آنکھیں ان ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ پھر سری پور کے عمائدین پٹواری اور اسکول ماسٹر کی دلہن جسے ادب سے ذوق تھا اور جو بی اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر جس کی شادی ایک ہلدی بیچنے والے سوداگر کے لڑکے سے ہو رہی تھی اور جو یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھی کہ کوئی پر پھڑپھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکیر شاعری کی بھی تھی۔ مگر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، پھر افراد ہی نہیں اس کی کہانی زندہ آئینے کی طرح صاف، زر روشن کی طرح درخشاں، منظر نگاری بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ سری پور ہے، یہ بازار، یہ شادی کی محفل، یہ دیہات کی صبح، یہ ارمانوں کی شام، کرشن چندر شاعرانہ افسانہ نگار ہے۔ مگر اس کی شاعری اس کی افسانوی صلاحیتوں کو مدھم کرنے کے بجائے اور روشن کر دیتی ہے۔ زندگی کے موڑ پر زندگی سے کوئی بے معنی صلح نہیں ہے نہ کوئی سستا انقلابی ترانہ ہے۔ بلکہ ایک مستقل سوال ہے۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

ایک اور کہانی جو مجھے پڑھتے ہی پسند آئی اور آج بھی پسند ہے راجندر سنگھ بیدی کی ہڈیاں اور پھول ہے ایک چڑچڑا شرابی موچی اکثر غصے میں آکر اپنی بیوی کو پیٹا کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ بیماری اور آئے دن کی مار پیٹ سے

تنگ آکر اپنے میکے چلی گئی۔ عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہ ملی اور موچی کو خیال ہوا کہ وہ مر گئی۔ مگر اس کی یاد اسے ستا رہی تھی وہ اکثر راتوں کو اس کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنا دل بہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اسے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ اچھی ہو گئی ہے اور واپس آنے والی ہے اس موچی کی بیقراری بیصبری، آدھ سیر جلیبی اور پاؤ بھر دودھ اپنی بیوی کے لیے منگوایا کاریگروں کو جلدی چھٹی دے کر اسٹیشن جانا اور وہاں سے مایوس ہو کر واپس آکر شراب پینا اور نشہ میں گالیاں دینا ذہن پر تفتیش ہو جاتا ہے۔ آخر دوسری بار اس کی بیوی آجاتی ہے۔ اور اسٹیشن پر دو تجسّس سہمی ہوئی آنکھیں فکرمندی کے احساس سے پلیٹ فارم پر گھومنے والے خوبصورت سے خوبصورت، متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بدصورت تلاش اور چڑ چڑے آدمی کی جو یا ہوتی ہیں۔ بیوی اس ملاپ کے نشے سے سرشار ہے اور اور ایک خاص قسم کی کیفیت میں ڈوبی چلی جا رہی ہے۔ پھر بیس کہیں اس کی ٹکر ہو جاتی ہے، مگر موچی اسے غصّے سے دیکھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ نئے ڈھنگ سیکھ آتی ہو پھر آنکھیں میری جان کو نہ کھو دینے،، کہ یہ تلاش چڑ چڑا مریل چمار بیدی کے پر زور مشاہدے کی بنا پر ہماری نظر میں ایک شخصیت کا مالک بن جاتا ہے جو منفرد بھی ہے۔ اور ہم سب کی کمزوری میں شریک بھی یہ عورت سے بیزار ہے مگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، بیدی کا شاہکارانہ احساس، اس کا قصہ تعمیر کرنے کا ڈھنگ اس کا مشاہدہ اس کا ایسے ماحول کا انتخاب جس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔

باوجود اس کہ زبان کی لغزشوں اور اس کی ٹیڑھی ٹیڑھی انشاء پردازی کے افسانہ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا یہی بات زین العابدین اور گرہن میں بھی ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ گرہن کا پہلا ہی جملہ پڑھ کر ایک اہل زبان نے کہا تھا۔ یہ کون سی زبان ہے کیا یہ اردو ہے؟ ، اور مجھے یہ کہنا پڑا کہ ہاں یہ اردو ہے، لیکن

ایک پنجاب نے لکھی ہے۔ اور قصہ بحر عرب کے ساحل سے متعلق ہے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے نہیں۔

عباس حسینی کا ایک افسانہ ہے۔ دو پٹے ایک نواب صاحب کا بچہ ہے جو بڑے چاؤ چونچلے سے پل رہا ہے وہ ایک چھوٹی سی مہترانی کو دیکھتا ہے یہ اپنی دادی کے بجائے آئی ہے ڈری سہمی جھجکتی گھبراتی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرتے میں منہمک ہے، ننھے نواب اسے تعجب سے دیکھتے ہیں۔ اتنے چھوٹے بھی ہوتے ہیں جن کے بال انھیں کی طرح سیاہ جن کے ہاتھ پاؤں انھیں ہی کی طرح چھوٹے چھوٹے مگر جو کوڑے سے کھیل سکتے ہیں دو دن وہ اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، تیسرے دن اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتے ہیں۔ بس اس گھڑی میں قیامت آجاتی ہے بڑی انا مہترانی کو لات مارتی ہے۔ دوسری مائیں گالیاں دیتی ہیں۔ بیگم صاحبہ گلے بلا کے چمٹ جانے پر ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چوٹی خیرات کرتی ہیں، مگر بچہ صرف یہی کہتا ہے،، میلی مہترانی بھاگ گئی، بچے کے جذبات کی کیسی اچھی تصویر ہے۔ جذبات بچوں میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی طرف تک توجہ کون کرتا ہے۔

اس پر ایک کہانی یاد آئی جو ممتاز مفتی کی اور اس کا نام ہے وہ بیگانگی ،، رشید کو اپنے چھوٹے بھائی محمود سے چڑ سی ہے۔ محمود نے اگر اس کی جگہ چھین لی ہے۔ جو ماں باپ کے دل میں اس کے لیے تھی۔ اس رقابت اور رشک و حسد نے شریر فسادی اور ضدی بنا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرے۔ اس کی شرارتیں درحقیقت اپنی شخصیت کے اظہار کی کوشش ہیں۔ جب کسی طرح اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تو وہ راہ چلتوں کو پتھر مارتا ہے اور محمود کے طوطے کو مار ڈالتا ہے۔

بچوں کی نفسیات پر تو ویسے ہی بہت ریسرچ کی گئی ہے مگر عورتوں اور مردوں کی نفسیات پر ایک ریسرچ تو اس قسم کی ہے جو عصمت چغتائی کے یہاں ملتی ہے دوسری وہ جو اختر انصاری کے ہاں عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ لیجیے مجھے ان کی ایک کہانی بھول بھلیاں پسند ہے۔ ایک کمزور مریل لاڈلا لڑکا اپنی بہنوں کے پیار سے تنگ آکر اپنی ایک رشتہ کی بہن سے الجھتا رہتا ہے جو اس کے ہاں رہتی ہے۔ یہ الجھن رفتہ رفتہ ایک پر اسرار محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر عصمت چغتائی نے جو عورتوں اور مردوں کی نفسیات پر اچھی نظر رکھی ہیں اس کہانی میں گھربار دھوپ چھاؤں بہنوں اور بھائیوں کی لڑائیاں، شادی کی پر اسرار کیفیتیں لڑکے کی وہ محبت جو بظاہر نفرت معلوم ہوتی ہے اور لڑکی کا رفتہ رفتہ سب کچھ سمجھتے بوجھتے بھی اس طوفان میں بہہ جانا بڑی کامیابی سے دکھایا ہے۔

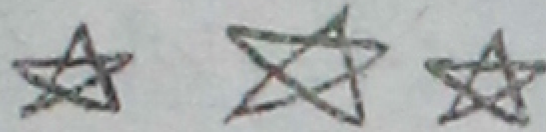
عصمت کے قصے اگرچہ ایک ہی عمر اور ایک ہی جذبے سے متعلق ہوتے ہیں۔ جو ۱۵ برس سے ۲۵ برس تک معیب سے تیز ہوتا ہے۔ مگر ان کی تصویروں میں ایک واقعیت بلکہ بے لچک صداقت ہوتی ہے بعض اوقات ہم اس واقعیت اور صداقت سے چڑ جاتے ہیں کمبخت کسی پاک مقدس اور ملکوتی جذبے کو تو دو بسار رہنے دیتی، مگر توبہ کیجیے اس ذہین، ضدی، دوربین نئی عورت سے یہ ہر شیرینی میں تلخی ملا دیتی ہے۔ اور ہر حسین خواب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اس تخریب کا حاصل کچھ نہیں جس طرح آتشیں شیشے سے کبھی کبھی آگ لگائی جا سکتی ہے۔ مگر اسے لے کر میدان میں نہیں نکلا جاتا اسی طرح عصمت کا آرٹ چیر پھاڑ اور آنکھ مچولی کا آرٹ ہے ماہر امراض خصوصی ہونا اچھی بات ہے۔ مگر بعض اوقات ڈاکٹر کو بھی مریض بنا سکتے ہیں۔

اختر انصاری کی کہانی پڑھیے تو پہلے پہلے وہ بھی کچھ فضول نظر آتی ہیں اتنی سی

بات تھی جسے افسانہ کر دیا، یہی خیال پیدا ہوتا ہے مگر نہیں بات اتنی سی نہیں۔
اس کی کوئی لیجیے۔ مثلاً ایک واقعہ یا ایک قصہ سنو، یا بظاہر قریب ان قصوں میں بہت
کچھ واقع نہیں ہوتا نہ کوئی محل جگمگاتا ہے، نہ کہیں انقلاب آتا، کوئی کسی پر عاشق
بھی کم ہی ہوتا ہے۔ ہر چیز نہایت خاموشی سے، دھیمی دھیمی چپ سی ہے مگر
اس خاموشی میں بلا درد و کرب اور اس دھیمے پن میں نہایت فنکارانہ ضبط و
نظم ہے شاعر جذبات کی رو میں بہنا چاہتے تھا تو افسانہ نویس اسے بہنے نہیں دیتا
ایک واقعہ لیجیے۔ ایک انٹر میں چند مسافر ہیں ایک وکیل ایک خان صاحب ایک،
شاعر، ایک آنریری مجسٹریٹ اور ایک میاں بیوی، میاں سو رہا ہے، بیوی وکیل خان
خان صاحب اور آنریری مجسٹریٹ کی گفتگو سن رہی ہے شاعر اس نوجوان عورت کو
دیکھ رہا ہے جو اگرچہ بہت حسین نہیں مگر کسی عورت کی عدم موجودگی میں شاعری
توجہ کا مرکز بننے کے لیے کافی ہے راستے میں چلتی گاڑی میں شور ہوتا ہے، ایک
دیہاتی غلطی سے بند ڈبے میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جب ناکام رہتا ہے تو
چلاتا ہے کہ گاڑی روکو ان سب کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ زنجیر کھینچنی چاہیے
مگر اس کے بجائے سب اپنے اپنے مشورے دیتے رہتے ہیں نوجوان عورت
جو اس اثنا میں ساری گفتگو خاموشی سے سنتی رہی ہے اٹھ کر زنجیر کھینچ دیتی ہے۔
سب اطمینان کا سانس لیتے ہیں مگر شاعر یہی سوچتا رہتا ہے کہ افسوس یہ عورت
پان نہیں کھاتی اگر پان کھاتی تو اس کے ہونٹ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔

غریبوں کی چیخ پکار، متوسط اور بالائی طبقے کے بے حسی، نقاب پوش
کی زندگی پیٹ کی آگ اور محبت کی آگ یہی ہمارے افسانوں کے عام موضوع
ہیں، آپ ان سے گھبرائیں تو گھبرائیں مجھے تو یہ اس وجہ سے پسند ہیں کہ ان میں ہماری
زندگی کا عکس ہے اگر آپ کہانیوں کے ذریعہ سے زندگی کی تلخیوں کو بھلانا

چاہتے ہیں تو آپ بھول کر بھی آج کل کے افسانے نہ پڑھیے۔ ان میں وہ سب باتیں آگئیں ہیں جو اقبال کے ابلیس نے جہاں رنگ و بو میں پائی تھیں۔
سوز و ساز درد و داغ و آرزو و جستجو۔



کچھ زہرِ عشق کے متعلق

ٹی۔ ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرے اور پورے ادب کو ذہن میں رکھے خصوصاً اسے وقت کے عطا کیے ہوئے تقدس سے بلند ہونا اور وقت سے آگے دیکھنا چاہیئے ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور اسی لیے عام تنقیدی خیالات ایک خاص دور کے لیے صحیح ہوتے ہیں مگر بعد میں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، اردو ادب پر یوں بھی بعض تاریخی وجوہات کے بنا پر مذہب و اخلاق اور رسم و احتساب کا رواج بہت سخت رہا ہے اس لیے ادبی کارناموں پر اچھے تنقیدی مطالعے کم ہیں عدالتی فیصلے اور مفتیانہ فتوے زیادہ یہی وجہ ہے کہ جب بعض ادبی کارنامے نقادوں کے سخت اعتراضات کے باوجود زندہ رہتے ہیں تو ان کی زندگی کے راز کو سمجھنا اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی زہرِ عشق ایک ایسا ہی ادبی کارنامہ ہے۔

زہرِ عشق کی مقبولیت کی تاریخ بڑی عجیب و غریب ہے۔ جب سے وہ شائع ہوئی اس کے حسنِ بیان نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے وہ سبھی کو

پسند آئی مگر بہت سے اس پسند پر ناک بھوں چڑھاتے رہے ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے رسالہ سہیل میں اردو کا ایک بدنام شاعر کے نام سے شوق پر ایک مضمون لکھا جو اس زمانے میں بہت مقبول ہوا اس میں فرماتے ہیں۔

محاورات پر یہ عبور بیگمات کے روزمرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت بیان کی سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے اور اس کے بعد بھی انہیں یہ کہنے کی جرأت ہے، نقادان شعر کے حلقوں میں سخن سنجوں کی صحبتوں میں پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں میں نواب مرزا شوق اور ان کی مثنویوں میں کچھ بھی وقعت و پرستش ہے۔ جو ان رایوں میں تضاد ہے اس پر ان کی نظر نہ گئی، حالانکہ وجہ ظاہر ہے مولانا شرافت تہذیب و اخلاق اور مذہب کا جو تصور رکھتے ہیں، اس کے مطابق زہر عشق بری ہے، مگر مولانا کے دل کی گہرائیوں میں جو سخن فہم چھپا بیٹھا ہے اس زمانے اس کی ادبیت کا بھی اعتراف کرا لیا بہر حال مولانا عبدالماجد کے نزدیک زہر عشق اپنی عریانی اور ہوس کاری کی وجہ سے مذمت کی مستحق ہے اور شوق لکھوی نے چونکہ آخر میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور دنیا کے فانی اور اس کی لذتوں کے عارضی ہونے کا تذکرہ کر دیا، اس لیے شوق کو دعائے خیر سے یاد کرنا چاہیے، حالانکہ مستحق کو دراصل وہ سزا کے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ خواجہ آتش کی متانت و شرافت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد وشہدوں اور لچوں کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں اور بے حیائی اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ ان کی چمک دمک قائم رہے تو اسی روشنی میں۔

جوشؔ نے اس ذہنیت کو ردعمل کے طور پر زہرِ عشق کو بے نظیر قرار دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ عفیف اور صالح قسم کے افراد کا انہیں ناپسند کرنا ہی ان مثنویوں کے شاہکار ہونے کی سب سے بڑی سند ہے، کیونکہ معشوق میں آلفت کے نزدیک تو زشت اسعنت، ظاہر ہے کہ یہ دونوں راہیں قابل وقعت نہیں، ایک کو رندی ایک آنکھ نہیں بھاتی دوسرے کو چونکہ مولویت سے بیر ہے اس لیے اس کی راستے کو ذرا بھی سننے کے لیے تیار نہیں اس کے مقابلے میں حالی راستے نہیں ہیں تو زیادہ توازن اور اعتدال ملتا ہے، حالی مثنوی کو بیانیہ شاعری کہتے ہیں اور اس کے لیے تسلسل، ربط مضامین داخلیت، جزئیات کی مصوری اور تناسب پر زور دیتے ہیں، اور ادب کا ایک سنجیدہ اور افادی تصور رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ معلم اخلاق بھی ہیں۔ مگر نرے معلم اخلاق نہیں ایک نکتہ سنج اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں۔ فرماتے ہیں۔

میر حسنؔ کے بعد مرزا شوقؔ کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں. شوقؔ نے غالباً واجد علی شاہ کے آخر زمانہ سلطنت میں لکھی ہیں۔ ان میں اکثر مقامات اس قدر ان مارل (ان کا مطلب ہے امارل) اور خلاف تہذیب ہیں کہ ایک مدت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا ہے لیکن اگر شاعری کے حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک ان کو بدر منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے، وہ قدیم الفاظ اور محاورات سے جو اب متروک ہو گیے ہیں۔ اور شعر اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ ان میں ایک قسم کا بیان، زبان کی گھلاوٹ، روزمرہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر کے

بہت بڑھاوا ہے، ان میں مرد اپنے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ شاید ہی اس بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا، اگرچہ ان مثنویوں میں بدر منیر کی طرح ہر موقع کا سین نہیں دکھایا گیا جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کا اندازہ ہو سکے، مگر جو کچھ اس نے بیان کیا ہے خواہ وہ نازل ہو یا ان نازل اس میں حسن بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، اس تعریف کے باوجود حالی کا فیصلہ واضح ہے کہ افسوس ہے کہ ان مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جا سکتی کہ جو شاعر اس نے ام مارل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے، اگر وہ اس کو اچھی طرح صرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فیصلے کا کام نہ لیتا تو آج اردو زبان میں اس کی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا۔

حالی سے ہماری اردو تنقید وزن وقار حاصل کرتی ہے۔ اس میں حکیمانہ نظر اور سماجی شعور پیدا ہوتا ہے، ادب اور زندگی کے رشتے کا احساس وجود میں آتا ہے۔ مگر حالی کے زمانے میں قومی ضروریات کے احساس نے لوگوں کے انفرادی مسرتوں کی طرف سے ذرا بے نیاز کر دیا تھا۔ حالی اس تخلیقی قوت کو گمراہ ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ جس سے قومی اخلاق سنوارنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے حالی کا بس چلتا تو ہر جوئے کہستان سے بستیوں میں چراغاں کرنے کے لیے بجلی تیار کرتے وہ برگ گل سے دلوں کے زخم پر مرہم رکھتے وہ سمندر کی طوفانی موجوں کی طرح عاشق کے جنون کو بھی آرام کرنے کی کوشش کرتے یہی وجہ ہے کہ زہر عشق کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے شوق کو تاریکی کا فرشتہ قرار دیا ہے۔ اور تنقید اس وقت صرف روشنی اور تاریکی کا علیحدہ علیحدہ تصور کر سکتی تھی وہ دونوں کی دھوپ

چھاؤں کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے مجنوں کی یہ رائے ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔ زہرِ عشق کی مقبولیت کا راز اس کی عمومیت میں ہے اور اس کا شمار ادبیات عامہ میں اس خصوصیت نے مثنوی کا عامیانہ بنایا اور اسی نے غیر فانی، اسی نے شوقؔ کو بدنام کر کے زندہ رکھا۔

زہرِ عشق جس ماحول کی پیداوار ہے اس میں لوگ زندگی کے معنی و مقصد کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا کر زندگی سے لطف اٹھانے کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے واجد علی شاہ کا لکھنو دراصل ایک طلسم ہوشربا ہے، بظاہر ایسی رنگین نظر فریبی اور دلبری، مگر اندر اندر ایک زوال آیا وہ تہذیب و تمدن کے شعلے کے بجھنے سے پہلے آخری لپک اور تھرتھراہٹ تھی جو سبق لکھنؤ شمشیر و سنان کو بھول چکا تھا۔ اسے صرف طاؤس و رباب کا سبق دیا تھا۔ اس نظام کی قیادت جس فارغ البال کے کے ہاتھوں میں تھی اس کا زندگی کا عمل اور تھا۔ مذہب و اخلاق کا تصور دوسرا دونوں میں مطابقت ضروری نہیں ہے، اس کا سر مذہب و اخلاق کے سامنے جھکتا تھا۔ مگر اس کا دل عیش امروز کے ساز پر دھڑکتا تھا۔ اس لیے اس کے ادب میں شریف مرد اور شریف عورت کا نقشہ کم ملتا ہے۔ اس زمانہ میں عورتیں اور مرد ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ وہ یا تو شبستان طرب تھا یا کسی کی دروبام کی محفل، اسی لیے ان قصوں میں عورتوں کی جیتی جاگتی تصویریں وہی ملتی ہیں جو ہیجان عشق نے بنائی ہیں، زہرِ عشق کے قصہ سادہ ہیں اس کے کردار بھی سادہ ہیں، مہ جبیں حسن کی صورت ہے جو عشق کے ہاتھوں اپنی شرافت اور خاندانی روایات کو ٹھکرانے پر مجبور ہو جاتی ہے، وہ مر کر جینا نہیں چاہتی، ایک داؤں پر جان کی بازی لگا دیتی ہے، شوقؔ کو خواجہ احمد فاروقی اور

دوسرے نقادوں نے نفسیات کا ماہر بتایا ہے حالانکہ نفسیات سے انہیں کچھ یوں ہی سا واسطہ ہے ان کے یہاں عشق اور شرافت میں کشمکش زیادہ شدید نہیں باوجود زبان اور بیان کی ساری خوبیوں کے زہر عشق کی زیادہ تر مقبولیت مہ جبیں اور اس کے عاشق کی آخری ملاقات کی وجہ سے ہے جس پر آنی والی موت کا سایہ پڑ رہا ہے مہ جبیں کی اس پستی میں مجنوں کو ایک جلال نظر آیا جو منیژہ اور اینا کرینینا کی یاد دلاتا ہے۔ زہر عشق کے قصے میں کئی خامیاں ہیں یہ شوق عام جذبات کے بیان پر قادر نہیں ہیں۔ ہیرو کی ماں کی گفتگو بالکل غیر فطری معلوم ہوتی ہے زہر عشق کا تو ہیرو بھی اپنی ہیروئن کے گہرے اور شکوہ جذبے کے سامنے ربیت کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے نسبتاً کم مگر انصاف یہ ہے کہ شوق اپنے دور کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں بہتر حقیقت نگار ہیں۔ اور در اصل زہر عشق کی مقبولیت کا راز اس کی حقیقت نگاری ہے۔ جو زیادہ تر زبان میں اور بعض اوقات بعض جذبات اور کرداروں کی مصوری میں ظاہر ہوتی ہے اردو کے نقاد چونکہ زیادہ تر اپنی عینک سے ہر چیز کو دیکھنے کے عادی رہے ہیں اس لیے انھوں نے معروضیت سے کام نہیں لیا۔ جس کی یہ مثنوی مستحق تھی۔ زہر عشق لکھنؤ کی عیش پرست اور رنگین ماحول کی ایک سادہ اور سچی تصویر ہے اس کے درد و اثر کا راز مہ جبیں کی بغاوت خودکشی میں ہی ظاہر ہو سکتی ہے کے خلاف کرتی ہے۔ اس زمانے کی بغاوت خودکشی ہی میں ظاہر ہو سکتی تھی مہ جبیں میں کم اور مہ لقا میں زیادہ یہاں طوائف کی جھلک نظر آتی ہے، زہر عشق میں دنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یہاں بیان کرنے والا موت سے ہم کنار ہو کر یہ سب کچھ کہہ

رہا ہے، زہر عشق کی اپیل میں کئی جذبات ملے جلے ہیں۔ اس میں کچھ شوخ وشنگ تصویریں ہیں کچھ سچے سادہ پر اثر مکالمے اور کہیں کہیں داغ کی سی شاعری کا چٹخارہ یہ چاشنی دوسری مثنویوں میں نمایاں نمایاں ہے اس لیے زہر عشق کے مقابلے میں وہ ادنیٰ درجے میں ہے بہار عشق کی خوبیوں یہ جتنی خوبیوں سے ملتی جلتی ہے مگر زہر عشق کی مہ جبیں کی بغاوت نے ایک عظمت ضرور اختیار کرلی ہے مہ جبیں عشق کی خاطر سماج سے بغاوت کرکے زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ شوق اس کے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ اس کی موت ظاہر کرتی ہے کہ شوق اپنے ماحول کے اخلاق نظام سے زیادہ دور نہیں جاسکتے تھے۔ وہ رند تھے مگر راہِ نجات کو بھولے نہ تھے جو نقاد صرف اپنے اخلاقی نقطہ نظر سے روش شوق پر فتوے صادر کرتے ہیں یا صرف فنی اور محاسن کی لَے سے اسے سراہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سچے اور فطری جذبات کے سچے بیان کی مقبولیت ہمیشہ رہے گی۔ مگر جب کوئی شاعر اس سے زیادہ مطالبہ کرے گا۔ اور اس کے ذریعہ سے زندگی میں معنی و مقصد ڈھونڈھنا چاہے گا اور تجربات کی قدر و قیمت پرکھے گا تو زہر عشق کا اچھا درجہ پائے گا مگر بڑا درجہ نہ ہوگا۔

یاد اپنی تمہیں دلاتے ہیں	پان کل کے لیے لگاتے جائیں
حسرت دل نہ کوڑی باقی ہے	اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی	بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

یہ سب اشعار زندہ رہنے والے ہیں ان میں جذبات کی وہ تھرتھراہٹ ہے جو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کرے گی مگر ان میں دیر تک متاثر

کرتے رہنے کی اور ایک گہری خلش بننے کا سامان کم ہے زہرِ عشق کو ایک زمانے میں ہمارے اخلاق کے پاسباں نے تخریب اخلاق قرار دے دیا تھا۔ جس طرح خلو بیرا اور آس کرواٹلڈ کو۔ دوسروں نے ان کی ضد میں امیر احمد امیر احمد دہلوی کے الفاظ میں چاند کا نور قرار دے دیا جس پر کوئی خاک نہیں ڈال سکتا،، زہرِ عشق دراصل اچھا قصہ نہیں ہے۔ یہ چند نازک اور حسین لمحات کا دلکش مرقع ہے اور اس حیثیت سے اس کی بقائے دوام میں کلام نہیں۔



تمام شد

مندرجہ ذیل کتب کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے، اسلیے جلد ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں خریدیئے

۱- اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں عبدالماجد دریابادی ۲/
۲- حسرت موہانی اضافہ شدہ ایڈیشن عہ
۳- ذوق ادب اور شعور (تنقیدی مضامین) عبدالشکور ۱/۸
۴- ادب اور نظریہ آل احمد سرور احتشام حسین ۲/۸
۵- نئے اور پرانے چراغ آل احمد سرور عہ
۶- اردو میں تنقید ڈاکٹر محمد حسن فاروقی ۲/۸
۷- ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۲/۸
۸- تنقیدی اصول اور نظریے ۲/۸
۹- مقدمہ شعر و شاعری حالی ۱/۵
۱۰- ادبی خطوط مرزا غالب عسکری ۳/
۱۱- مرزا امیر امیر احمد دہلوی ۱/
۱۲- ہند کے مسلمان شعراء نورانی ۱۲/
۱۳- ایک نادر روزنامچہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی عار
۱۴- ساحل و سمندر و سفرنامہ امریکہ ۲/۸
۱۵- اردو کے ہندو ادیب ناظر کاکوروی احتشام عہ
۱۶- سرمایہ زبان اردو جلال لکھنوی ۲/۸
۱۷- کف گل فروش و مزاحیہ مضامین ۳/
۱۸- پیسہ اور پرچھائیاں (ڈرامہ) علامہ انجم فوقت ۳/
۱۹- اپنی موج میں مزاحیہ مضامین ادارہ ڈاکٹر محمد حسن ۲/۸
۲۰- شرح دیوان اردو سے غالب طباطبائی ۲/۸
۲۱- جوئے رواں دیوان حامد اللہ افسر ۲/۸
۲۲- ثنائے حبیب تقیہ کلام بہزاد لکھنوی ۲/
۲۳- راتیں (ڈرامہ) شجاعت علی سندیلوی ۱/
۲۴- اچھی نظمیں اخگر مشتاق ۵/
۲۵- قیامت صغرا ناول خان محبوب طرزی ۳/
۲۶- ایک جان تین قالب " ۳/
۲۷- دوشیزہ قات عہ
۲۸- دریا ستوش سماجی ناول ۲/۸
۲۹- زیب ساحرہ تاریخی ناول ۱/۸
۳۰- سید ساجد او غازی وعلی محمود آبادی ۳/
۳۱- معمار (تاریخی ناول) مائل ملیح آبادی ۱/۸
۳۲- سفر " " ۳/
۳۳- غزنی دروازہ اسلامی ناول مائل ملیح آبادی ۱/۸
۳۴- حرمیلوں کا بادشاہ حکیم بابا علی عباسی ۳/
۳۵- رخسار سحر ناول ظفر کریم قدوائی ۲/۸
۳۶- دور نظر مضامین تنقید اختر انوری ۱/۸
۳۷- تنقیدی مضامین مجنوں گورکھپوری ۲/
۳۸- ہنسیا ہے گنجی پروفیسر کلیم الدین ۲/

پیسہ اور پرچھائیں

ڈاکٹر محمد حسن کے ریڈیو ڈرامہ جو ابھی تک فراموش گوشہ بنے ہوئے تھے۔ اب طبع ہو کر جنت نگاہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں مصنف کا تازہ مشہور ڈرامہ بھی شامل ہے جسے ڈراموں کے ہندوستان گیر مقابلے میں آل انڈیا ریڈیو نے بہترین قرار دیا تھا اور جس پر پانچ سو روپیہ کا اول انعام دیا گیا تھا۔

پیسہ اور پرچھائیں قوس و قزح کی طرح ہفت رنگ ہے اس میں تاریخی ڈرامے بھی ہیں اور سماجی بھی، آنسو بھی ہیں قہقہے بھی یہ ایک نسل کے جذباتی مد و جزر کا آئینہ ہے

ان میں ڈاکٹر محمد حسن کا تخلیقی فن ان بلندیوں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے جن کو تنقید نگاری کی حیثیت سے اس نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے نو ڈراموں کا مجموعہ ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت ہے ۳/

سخنہائے گفتنی:۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی بے لاگ تنقید میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ادارہ فروغ لکھنؤ سے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ سخنہائے گفتنی جلد طلب فرمائیے قیمت ۱۲/

تھنے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ

(مع اضافہ جدیدہ) آل احمد سرور کی وہ بلند پایہ تصنیف جس نے ہندو پاکستان کے ادبی حلقوں میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ فروغ اردو ۳۷/۱۱۳ امین آباد پارک لکھنؤ

